ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 3 | MAY 1984 | No. 3

وقت کے اہم، نازک اور زیرِ بحث موضوع

اسلام میں عورت کا مقام

پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا مدلّل و مفصّل خطاب

کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

جس میں اس خطاب کے علاوہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "نقوش اقبال" سے ماخوذ

عورت اقبال کے کلام میں

نیز اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا ماہنامہ آنچل کراچی میں شائع شدہ انٹرویو اور روزنامہ جنگ لاہور فورم میں بات چیت بھی شامل ہیں

عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۱۲۸

قیمت ـــــ فی نسخہ دس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(ملنے کا پتہ)

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۔ ۳۶، کے، ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی ۔ نمبر ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی ۱

وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ (مرحوم)

شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ

مطابق

مئی ۱۹۸۴ء

جلد : ۳

شمارہ : ۳

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ابصار احمد

ایم اے - ایم فل - پی ایچ ڈی

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

ایم اے فلسفہ

حرف اوّل ______ ۳
ڈاکٹر ابصار احمد

الٓمّٓ (سورۂ شعراء) ______ ۵
ڈاکٹر اسرار احمد

حضرت عمرؓ اور تصوف ______ ۱۳
ڈاکٹر غلام محمد

قرآن عظیم کی زبان ______ ۳۱
محمود خورشید

قرآنی ادب و ثقافت ______ ۴۱
پروفیسر حافظ احمد یار

درس حدیث ______ ۴۸
ریاض الحق

سیرۃ الخلیل (باب ثانی) ______ ۵۱
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت ______ ۵۴
مولانا محمد تقی امینی

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام ______ ۶۱
مولانا محمد طاسین

یکے از مطبوعات : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن : لاہور

مطبع : آفتاب عالم پریس - زرسالانہ /۳۰ روپے، اس شمارہ کی قیمت ۳/ روپے

آپ کے احباب کے لیے بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

"مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے

دورانِ ماہِ رمضان اہل وعیال اور اعزّہ واقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے!

(نوٹ) اس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے!

شائع کردہ

مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن لاہور

۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۱۴ فون: ۸۵۲۶۱۱

ڈاکٹر ابصار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ایک طرف جدید دنیا سائنس اور ٹکنالوجی کے انتہائی کناروں کو چھو رہی ہے۔ تو دوسری طرف خود زمین کی گود میں ناخواندگی بھی کم ہونے کی بجائے پل بڑھ رہی ہے۔ یونیسکو کے زیر اہتمام ایک سروے کے مطابق ۱۹۸۱ء میں دنیا میں بالغ افراد کی آبادی کا ۲۹ فیصد یعنی ۸۲ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد ناخواندہ تھے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تعداد مرورِ زمانہ کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ناخواندگی کے نقصانات ایک دو نہیں، متعدد ہیں۔ ان کا اثر صرف تعلیمی پہلو پر نہیں بلکہ سماجی، معاشی سیاسی اور صحیح تر الفاظ میں پوری زندگی پر ہے۔ ناخواندگی کا خاتمہ ہمہ گیر انسانی سطح پر بین الاقوامی برادری کا ایک اخلاقی فرض ہے، تو دوسری طرف از روئے اسلام خواندگی اور حصول علم مسلمانوں پر فرض ہے۔ خواندگی کے عمل میں سب سے زیادہ اہمیت ماحول کی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کم از کم مسلمان ممالک میں خواندگی کی شرح صد فیصد ہونی چاہیئے۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے اور تعلیم و تعلّم کی جتنی تاکید دین اسلام میں ملتی ہے اس کی مثال شاید کوئی اور مذہب پیش نہ کر سکے۔ خود اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے لیے اپنے آخری ہدایت نامے کا نام "قرآن" تجویز کیا۔ جس کا لغوی مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جسے بار بار پڑھا جاتا ہے۔ یعنی اسے صرف کتاب مقدس سمجھ کر پاک صاف اور بلند جگہ پر رکھ دینا اس کے ادائے حقوق کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس کو پڑھنا، اس کے مفاہیم کی سمجھ، اس پر غور و تدبر اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل اس کے حقوق کے لازمی تقاضے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ خواندگی کے بنیادی معیار پر پورا اترے بغیر کوئی مسلمان اس کلام پاک کو نہیں پڑھ سکتا۔ اور اگر وہ اسے پڑھ نہیں سکتا تو قرآن کریم کے دوسرے جملہ حقوق کسی درجے میں بھی پورا کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ناخواندگی کے خلاف جدوجہد ہر مسلمان کا قومی و سماجی ہی نہیں، مذہبی فریضہ بھی ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ علم و حکمت کی قدر خالق کائنات کی نظر میں دیگر تمام چیزوں سے زیادہ ہے۔ میں یہاں چند آیات پیش کرتا ہوں۔ جو اس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ٥

اور ان (قرآن کی دی ہوئی تمثیلات) کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ (سورۃ العنکبوت : ۴۳)

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے والے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں (یعنی جن کے اندر علم معرفت کی روشنی ہے (سورۃ فاطر : ۲۸)

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے پوچھو کیا علم و بصیرت رکھنے والے اور وہ جو علم و بصیرت نہیں رکھتے، دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ (سورۃ الزمر : ۹)

يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ٥ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ٥

وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا (خزانہ) مل گیا۔ اور یہ درس وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ : ۲۶۹)

ان آیات میں دو لفظ "علم" اور "حکمت" استعمال ہوتے ہیں۔ مفسرین نے علم و حکمت کے درج ذیل معانی لکھے ہیں، فطری صلاحیتوں کو زندہ کرنا، عقل سے کام لینا، مظاہر کائنات سے اللہ کی معرفت حاصل کرنا، صاحب بصیرت ہونا، معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرنا، عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کا حامل ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

اور خواندگی چونکہ مندرجہ بالا اوصاف کے حصول کا لازمی وسیلہ ہے، بالفاظ دیگر علم و حکمت کے حصول کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے اس لیے اس کا "حصول" بھی ضروری ہوا۔ چنانچہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ دوسری قوموں کی طرح شرح خواندگی بڑھانے اور اس کی اہمیت کی تشہیر کے لیے ذرائع و وسائل استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ بطور مسلمان ہم میں سے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ خود خواندہ ہو، تعلیم حاصل کرے اور دوسروں اور بالخصوص اپنے متعلقین کو پڑھنے لکھنے اور حصول علم کی طرف ترغیب دے۔ موجودہ حکومت کا "مسجد مکتب" کا پروگرام بھی اس سلسلے کا ایک اہم اور مفید کام ہے۔

oooo

سلسلۂ تقاریر الّٓمّٓ

سورۃ الشعراء

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم ! احمدہ و اصلی علی رسولہ الکریم اما بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ
نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ
مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝
آمنت باللہ صدق اللہ العظیم ۔

سورہ نمل پر ان سورتوں کا ذکر ختم ہوا جو ایک ایک یا دو دو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں ۔ اور اب ہم متوجہ ہوتے ہیں ان سورتوں کی جانب جن کے آغاز میں تین تین حروف مقطعات آتے ہیں ۔ قرآن حکیم میں ایسی سورتوں کی کل تعداد ۱۳ ہے ۔ دو سورتوں کا آغاز ہوا ہے طٰسٓمّٓ سے اور ۵ سورتوں کا آغاز ہوتا ہے الٓرٰ سے اور چھ سورتیں ہیں جو شروع ہوتی ہیں الٓمّٓ سے ۔ حسن اتفاق سے یہ دو سورتیں جو طٰسٓمّٓ سے شروع ہوتی ہیں، یعنی سورہ شعراء اور سورہ قصص ۔ یہ دونوں سورتیں سورہ نمل کے دونوں طرف واقع ہیں ۔ یعنی سورہ شعراء اس سے پہلے ہے اور سورہ قصص اسکے بعد ہے ۔ سورہ شعراء قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں سے تعداد آیات کے اعتبار سے طویل ترین سورت ہے ۔ اس میں آیات کی تعداد ۲۲۷ ہے ۔ جو ۱۱ رکوعوں

میں منقسم ہے - اتنی ہی تعداد مکی سُورتوں میں کسی اور سورت کی نہیں - سُورۂ اعراف جو حجم کے اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے بڑی مکی سورت ہے - اسکی آیات کی تعداد ۲۰۶ ہے اور یہیں سے ایک اسلوب کا فرق سمجھ لینا چاہیئے -

قرآن مجید کی جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں ان میں آیات چھوٹی ہیں اور ردھم تیز ہے - صوتی آہنگ بھی بہت نمایاں ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا چلا گیا بعد میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں آیات طویل ہیں اور ان میں صوتی آہنگ بھی اتنا زیادہ نمایاں نہیں رہتا - اور ردھم بھی کچھ مدہم (Light) ہو جاتا ہے - چنانچہ سورہ اعراف ۲۰۶ آیتوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے رکوع ۲۴ ہیں اور وہ سوا پارے پر پھیلی ہوئی ہے - جبکہ سورہ الشعراء ۲۲۷ آیات پر مشتمل ہے - لیکن یہ کہ وہ وسعت میں نصف پارے سے بھی کم پر پھیلی ہوئی ہے - سورۂ شعراء کا مرکزی مضمون ہے -

اَلتَّذْکِیْرُ بِاَیَّامِ اللّٰہِ

یہ خود قرآن مجید کی اصطلاح ہے - اَیَّامُ اللّٰہِ سے مراد ہیں وہ دن جن میں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے - مزید براں اسی تذکیر بایام اللہ سے مراد وہ ادوار بھی ہیں کہ جن میں جزیرہ نمائے عرب اور اس کے اطراف و جوانب میں مختلف اوقات میں جو اولوالعزم رسول مبعوث ہوئے اور ان کی قوموں نے ان کی دعوت سے انکار کیا کفر کی روش اختیار کی جسکے نتیجے میں ان پر عذابِ ہلاکت عذابِ استیصال نازل ہوا - تو ان رسولوں کے ذکر اور ان قوموں کے انجام کے ذکر سے تذکیر اور نصیحت اور یاد دہانی اور دعوت و تبلیغ ہے یعنی التذکیر بایام اللہ -

چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں ۳ رکوعوں پر تو تفصیل کے ساتھ حالات پھیلے ہوئے ہیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے - یہ واقعات تقریباً وہی ہیں کہ جو سورۂ طٰہٰ میں قدرے تفصیل کے ساتھ آچکے ہیں البتہ اسلوب کا

فرق ہے الفاظ کا فرق ہے، انداز کا فرق ہے بقول شاعر

؎ اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہی انداز اکثر اس سورت میں آئے گا۔ اگرچہ مضامین تقریباً وہی ہیں جو سورہ طٰہٰ میں آئے ہیں لیکن انداز میں بڑا نمایاں فرق ہے۔

اس کے بعد ایک ایک رکوع میں حضرت ابراہیم حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے حالات اور ان کی قوموں کی روش اور ان کے انجام کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم کے ذکر کے ضمن میں ان کے ایک ترانۂ توحید کو نقل کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قدر جامع اور اتنا مؤثر اور اتنا دل پذیر اور دلنشین ترانۂ توحید شاید کوئی اور ممکن نہ ہو۔ آنجناب ؑ کا قول نقل ہوا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ (۷۸ تا ۸۲)

"میں اس اللہ کا ماننے والا ہوں۔ میں اس کا پجاری ہوں میں اس کا پرستار ہوں جس نے مجھے پیدا کیا جو مجھے راستہ دکھاتا ہے اور جو مجھے کھانا کھلاتا ہے اور پانی پلاتا ہے وہی ہے کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو تو مجھے شفا بخشتا ہے وہ وہی ہے جو مجھ پر موت وارد کرے گا اور پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اور وہی ہے کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن جزا و سزا کے دن وہ میری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا۔"

دوسری مکی سورتوں کی طرح سورہ شعراء کے بھی آغاز اور اختتام دونوں پر نبی اکرم ﷺ سے خصوصی خطاب ہے اور اس کے ضمن میں چونکہ رسالتِ محمدی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصل مظہر قرآن مجید ہے لہٰذا قرآن مجید کی صداقت اور حقانیت اور اس کی عظمت اور علو مرتبت کا بیان ہے چنانچہ آغاز میں فرمایا گیا۔

طٰسٓمٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

یہ آیات ہیں کتاب مبین کی اور اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! شاید کہ آپ اپنے آپ کو اس رنج اور صدمے سے ہلاک کر لیں گے کہ یہ ایمان نہیں لاتے ہے۔ اس کا ذکر اس سے پہلے سورہ طٰہٰ کے ضمن میں بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اختتام کی طرف آتے فرمایا

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۹۲)

سارا ذکر قرآن حکیم کا ہے قرآن نازل ہو رہا ہے اس ہستی کی طرف سے جو تمام جہانوں کی مالک ہے اور پروردگار ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ (۱۹۳)

اس کو اتارا ہے رُوح الامین کے ذریعے جو لقب ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا۔

عَلٰى قَلْبِكَ

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کے قلب مبارک پہ

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ (۱۹۴)

تاکہ آپ خبردار کرنے والے بن جائیں۔ لوگوں کو Warn کرنیوالے اعراض و انکار اور کفر کی صورت میں جو پاداش ملنے والی ہے اس سے خبردار کرنے والے بن جائیں۔

چند آیات کے بعد فرمایا:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ (۲۱۰)

اس قرآن کو شیاطین جن نے نازل نہیں کیا، کوئی بد روح نہیں ہے کہ

جو اس کو نازل کرنے والی ہو۔ اس میں نفی کی جا رہی ہے اس خیال کی جو آغاز میں مکہ والوں کی جانب سے ظاہر ہوا تھا کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کسی بد روح کا سایہ ہو گیا ہے آپؐ کسی آسیب کے اثر میں آ گئے ہیں اور وہ ہے کہ جو انہیں یہ کلام سکھا رہا ہے۔ اسکی تردید کی جا رہی ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ۝ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ (۲۱۰-۲۱۱)

غور تو کرو، عقل کے اندھو! عقل کے ناخن لو! اس کلام کو دیکھو کیا یہ کلام واقعی ہی تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ شیاطین اسکے شایان شان ہوں شیاطین اس پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ کہ وہ ایسا کلام موزوں کر سکیں یا نازل کر سکیں۔

إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ۝ (۱۲۲)

اور یہ شیاطین جن عام دنوں میں کچھ ادھر اُدھر سے سن گن لیکر اپنے جو ماننے والے ہیں انہیں کچھ جھوٹی سچی باتیں بتا بھی دیا کرتے تھے تو اب تو نزول قرآن کے زمانے میں ان پر پابندیاں لگ چکی ہیں۔ انہیں بیڑیاں پہنائی جا چکی ہیں اب وہ ادھر اُدھر سے کچھ سن گن بھی نہیں لے سکتے۔

آخر میں ان کے اس خیال کی بھی نفی کی گئی کہ محمدؐ شاعر ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، معاذ اللہ! فرمایا گیا۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ (۲۲۴)

خود غور کرو سوچو، شعراء کا اپنا ایک کردار ہوتا ہے شاعر کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ کیا کسی درجے میں بھی محمدؐ پر وہ کردار چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ شعراء کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ اور ان کے صحابہ ان کے جاں نثار تو تمہارے معاشرے کے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں۔ جیسے ابوبکرؓ،

عثمانؓ - طلحہؓ، زبیرؓ بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہؓ ابن الجراح وغیرھم -
پھر شاعروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ :

اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ (۲۲۵)

" تم دیکھتے نہیں کہ شاعر لوگ تو ہر وادی میں سرگرداں ہوتے ہیں - ابھی زمین کی بات کر رہے ہیں تو ابھی آسمان کی خبریں لا رہے ہیں - ان کے ہاں مبالغہ آمیزی ہوتی ہے - شاعر کے شعر کی تاثیر کے لئے مبالغہ لازمی سمجھا گیا ہے - اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۲۶)

ان کا کردار روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں! اچھے سے اچھے شاعر بڑے بڑے شاعر، بھی، واقعہ یہ ہے کہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کا یہ تبصرہ ان پر بالکل راس آتا ہے - ان کے قول و عمل کے اندر اکثر و بیشتر ایک تضاد اور ایک بڑی خلیج حائل نظر آئے گی - تو کہاں شعراء اور انکا کلام اور کہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہ کتاب مبین، یہ قرآن مجید -

اس سورہ مبارکہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو خصوصی ہدایات بھی دی گئیں - ایک یہ بھی

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝ (۲۱۴)

اے نبیؐ! آپؐ کی دعوت کا آغاز اپنے اعزا و اقارب سے ہونا چاہیئے سب سے پہلے خبردار کیجئے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس لئے کہ دین اسلام کی تبلیغ کے لئے فطری طریق یہی ہے کہ

الاقرب فالاقرب

جو داعی سے جسقدر قریب ہو اتنا ہی اسے دعوت و تبلیغ میں مقدم رکھنا چاہیئے - دوسری ہدایت یہ دی گئی -

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲۱۵)

اور اے نبیؐ! جو آپؐ پر ایمان لے آئے ہیں جو آپؐ کا اتباع کر رہے ہیں جو آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے کوشاں ہیں۔ جو آپؐ کے جاں نثار ہیں۔ ان کے لئے آپ اپنے کاندھے جھکا دیجئے۔ ان کا اعزاز و اکرام فرمایئے۔ ان سے محبت کیجئے۔ ان سے شفقت کے ساتھ پیش آیئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی دین اور اللہ کی عطا ہے آپؐ کے لئے۔ اللہ نے ان کو آپؐ کی رفاقت کے لئے چن لیا ہے۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم
ونفعنى وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

(بقیہ: مروجہ نظام زمینداری)

سعید ابن المسیب، سعید بن جبیر، سالم بن عبداللہ، مجاہد، عطاء، مکحول، شعبی، مسروق، عکرمہ اور حماد تھے۔ بعض روایات کے مطابق محمد بن سیرین اور قاسم بن محمد بھی ان میں شامل تھے۔

علماءِ تابعین کی اتنی بڑی تعداد کا مزارعت کو ناجائز سمجھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حضرات ان احادیثِ نبویہ کو صحیح، راجح اور ناسخ سمجھتے تھے جو نہی مزارعت سے متعلق تھیں، نیز اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک معاملہ خیبر مزارعت کا معاملہ نہ تھا ورنہ وہ کبھی مزارعت کو ناجائز نہ کہتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آخر دم تک اور پھر حضرت عمر فاروق بھی کچھ عرصہ تک اس پر قائم رہے، مطلب یہ کہ اگر یہ معاملہ مزارعت کا معاملہ ہوتا تو کہنا تو درکنار کوئی اس کے ناجائز ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

مذکورہ ترتیب کے مطابق اب میرے سامنے بحث و تحقیق کا جو مرحلہ ہے اس کا عنوان "مزارعت اور ائمہ اربعہ" ہے۔

(جاری ہے)

فہم قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعے کے ضمن میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف

ضرور مطالعہ کیجئے

(کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے)

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ھدیہ: ۱۰ روپے

حضرت عمرؓ اور تصوّف

ڈاکٹر غلام محمد

حضرت عمر اور تصوف؛ بظاہر عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ذہن کے پردہ پر یہ تصویر اصل سے کچھ مختلف نظر آتی ہے مگر سچ مانئے قصور عکس و شبیہ کا نہیں، بلکہ پردہ ذہنی کا ہے۔ ذہن کا جھول دور ہو اور فکر کی سلوٹیں نکل جائیں تو آپ ہی آپ انکار اقرار میں بدل جائے گا، اس لئے پہلے ضرورت اصلاحِ فکر کی ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ابن خطاب خلیفہ راشد تھے اور انکی حکومت خلافتِ راشدہ تھی منہاج نبوت کے عین مطابق تھی۔ مگر جو لوگ یہ سب کچھ مانتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ "خلیفہ راشد" کون ہوتا ہے۔ "خلافت راشدہ" کیا ہوتی ہے۔ اور رہا تصوّف و احسان" اس کا صحیح منشاء و مفہوم خود عام مدعیان تصوف کو بھی کم ہی معلوم ہے تو اوروں کا کیا ذکر، اس لیے پہلے ان تین اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم پیش کرنا ضروری ہے تاکہ ظاہر بین نگاہ حقیقت کو پا سکے۔

۱ - خلافت راشدہ دراصل نبوت محمدی کا تتمہ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ارشاد ہے۔

ایام خلافت بحقیقت ایام نبوت	زمانہ خلافت زمانہ نبوت ہی
بود ولیکن وحی از آسمان	تھا مگر (فرق یہ تھا کہ اب)
فرو نمی آمد[1]	آسمان سے وحی نہ آتی تھی۔

۲ - خلیفۂ راشد مراتبِ ولایت کے اوج و انتہا پر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب ہی کی مستند زبان میں خلیفہ راشدہ وہ ہے کہ:

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء - فصل دوم

جوہر نفس او شبیہ جوہر نفس انبیاء آفریدہ باشد و در قوت عاقلہ او نمونہ وحی ودیعت نہادہ باشد و آں محدثیت است،[1] و در قوت عاملہ او نمونہ از عصمت گذاشتہ و آں صدیقیت است و فرار شیطان از ظل او الا آنکہ استعداد نفس او خواب آلود است تا پیغمبر ایقاظ آں نکند بیدار نہ شود [2]

جس کا جوہر نفس انبیاء کے جوہر نفس کے مشابہ پیدا کیا گیا ہو اور اسکی عقلی قوت میں وحی کی مشابہت رکھی گئی ہو جو محدثیت[1] کہلاتی ہے اور اسکی عملی قوت میں عصمت (انبیاء) کی مشابہت ہو جو صدیقیت کہلاتی ہے اور شیطان اس کے سایہ سے بھاگے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے نفس میں یہ صلاحیت اس وقت تک سوئی ہوئی رہتی ہے جب تک پیغمبر اسکو جگا کر بیدار نہ کرے۔

۳ - خلیفہ راشد اپنے دور میں اُمت کا افضل ترین فرد ہوتا ہے۔
شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے الفاظ ہیں۔

از لوازم خلافتِ خاصہ آں است کہ خلیفہ افضلِ امت باشد در زمان خلافت خود عقلاً و نقلاً [3]

خلافت راشدہ کے لوازم سے ایک یہ ہے کہ خلیفہ اپنے وقت میں تمام اُمت سے افضل ہو، عقلی اور نقلی دونوں دلائل سے

۴ - قرنِ اوّل میں علوم تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرح "تصوّف" (یا نبوی اصطلاح میں احسان) کی اصطلاحات اور اس فن کی تدوین بلاشبہ نہیں ملتی مگر

---

[1] محدثیت سے مراد فہم کی وہ اعلیٰ استعداد ہے جس میں عام قوتِ فکریہ کی محتاجی نہ رہے

[2] ازالۃ الخفاء فصل سوئم

[3] ازالۃ الخفاء - فصل دوم - حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن، حدیث، عمل نبوت اور تعامل صحابہ سے بھی اور بے شمار عقلی دلائل سے بھی اس دعوے کو ثابت کیا ہے تفصیل کے لئے اصل کتاب دیکھیں

اس کے صحیح مصداقات سب وہاں موجود ہیں۔ اس لئے دورِ صحابہ میں لفظ و اصطلاح کو نہ پاکر ان کی اصل و حقیقت کا انکار نادانی ہے۔

۵ - فیضانِ نبویؐ کے اثرات سے صحابہ کا سلوک نہایت مخفی اور بہت مختصر تھا۔ اس لئے سلوک کی تفصیلات وہاں نظر نہیں آتیں مگر حاصلِ سلوک صاف طور پر وہاں دیکھا اور پایا جا سکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں۔

اوشاں ایں نعمت عظمیٰ نسبت	ان حضرات (صحابہؓ) پر یہ نعمت
عزیز الوجود در قدم اوّل بہر	عظمیٰ اور نسبت نادرہ پہلے ہی
ظہوری آید [1]	قدم میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

۶ - طریق تصوّف کا حاصل اور منتہا سیدی و سید العلماء حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کا زبان اعجاز بیان میں ہے:

"ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو "نسبت" کہتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی زبان میں اسکی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً انہی کے لئے نوید بشارت ہے" [2]

پہلے تین توضیحی مقدمات سے یہ بات ذہن میں جم جانی چاہیئے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ کے جتنے کمالات ظاہر و باطن ہیں ان کی اصل ان کے "جوہرِ نفس" کا کمال ان کی "قوت عاقلہ" "عاملہ" کی مخصوص کسبی نہیں بلکہ یہی استعداد ہے اور ان کی فتوحات اور ملکی نظم و نسق کے کارنامے، عام

---

[1] مکتوب (۳۲)، دفتر اول - مکتوبات مجدد الف ثانیؒ

[2] مکاتیب سلیمان "مرتبہ مولانا مسعود عالم مرحوم

حکمرانوں اور ملک گیروں سے اپنی اصل و حقیقت میں بالکل الگ غیر معمولی روحانی قوت وربانی تائیدات کا کرشمہ تھے۔ مگر اہل ظاہر کی نگاہ اس باریکی تک نہ پہنچ سکی اور انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فاتح اعظم، مصلح اعظم، ماہر نظم و نسق تسلیم کر کے گویا اعتراف عظمت کا حق ادا کر دیا حالانکہ اس سے خلافت راشدہ کی تقدیس اور خلیفہ راشد کے مرتبہ روحانی اور عظمتِ ایمانی کا کچھ بھی حق ادا نہ ہوا بلکہ تعریف میں تنقیص کا پہلو پیدا ہو گیا ؎

این نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

جب تک نگاہ ایمانی میسر نہ ہو ظاہر کی یکسانیت خود مسلمان کے لئے بھی وجہ حجاب ہی بنی رہتی ہے ؎

آب تلخ و آب شیریں ہم عناں   درمیان شاں برزخ لایبغیان   (رومیؒ)

بہرکیف ان تین مقدمات کو سمجھنے کے بعد بقیہ چار توضیحی مقدمات کی روشنی میں تصوف و سلوک سے متعلق جو غلطیاں یا غلط فہمیاں ذہن میں تھیں وہ بھی دور ہو چکی ہوں گی اور یہ تسلیم کرنے میں کوئی تأمل نہ رہ گیا ہوگا کہ حاصل تصوف یعنی "مقام رضا" میں تمکن تو در اصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور انکے رفقائے مقدس ہی کا حصہ تھا اور وہی اس رتبۂ عالی کی الٰہی سند بھی رکھتے تھے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ — ورنہ اوروں کے حق میں تو یہ بات ظن غالب سے زائد درجہ کی نہیں۔

اسی روشنی فکر و نظر کو لئے ہوئے اب سیرت عمرؓ کے خاص خاص باطنی پہلوؤں پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ فاروق اعظمؓ صوفی اعظم اور محسنِ[1] اعظم تھے ان کے جوہر نفس میں انبیاء کے جوہر نفس سے مشابہت تھی وہ محدث تھے، یعنی مہمات امور کی فہم میں وہ عام قوت فکریہ کے محتاج نہ تھے بلکہ اعلےٰ ترین الہاماتِ ربانیہ سے انکی دستگیری اور رہنمائی ہوتی رہتی تھی اور ان کے سایہ سے شیطان بھاگتا تھا۔ یہ سب ان کے معنوی کمالات ہی تھے جو فن تصوف و احسان کے تحت آتے ہیں اور انہی کا اجمالی تعارف ہمارے موضوع

---

[1] "محسن" قرآنی و حدیثی اصطلاح میں نہ کہ ہماری زبان کے محاورہ میں۔

کا منشاء ہے -

حضرت عمرؓ کا جوہر نفس

ہر انسان کا "وہ شاکلہ" یا اسکی طبعی استعداد ایک مانگی عطائے ربّانی ہے حکمت الٰہیہ نے جس کو جو چاہا بنایا (خلق ما یشاء) اسی وہبی استعداد کے مطابق انسان ترقی کے منازل طے کرتا ہے (کل یعمل علٰے شاکلتہ) اعلٰے سے اعلیٰ مربی بھی بس جوہر استعداد ہی کو چمکا سکتا ہے - نیست کو ہست کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام (تم میں جو جاہلیت میں اچھے تھے اسلام میں بھی اچھے ہیں) میں اسی رمز کا اظہار ہے — اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر حضرت عمر فاروق رضؓ کی طبعی استعداد یا ان کے "جوہر نفس" کو دیکھئے تو آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی' اللہ اللہ کیا جوہر ہے اور کیسی استعداد کہ وحی ربانی کے چند کلمات کان میں پڑتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں، رگ وپے میں بجلیاں بھر جاتی ہیں اور کائنات ہستی جاگ اٹھتی ہے - یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا - اگرچہ آگ اُسے نہ بھی چھوئے)

پھر یہی نہیں بلکہ بارگاہ نبوت کی پہلی حاضری اور نگاہ نبوی کے پہلے ہی فیضان میں جوہرِ فاروقی کو وہ جِلا ملی کہ وحی الٰہی سے کامل مناسبت اور خاص ربط دفعتہً پیدا ہو گیا ان کی زبان حق ترجمان بن گئی اور وہ اتنے بلند ہو گئے کہ خاتم الانبیاء (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ان کے جوہر نفس کی تعریف یوں فرمائی - لوکان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب[1] میرے بعد (بالفرض) اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ بن خطاب ہوتے اس کے صاف معنی یہی تو ہوئے کہ ذاتِ محمدیؐ (علی صاحبہا الصلوٰت والتحیات) پر نبوت کا ختم ہو جانا الگ بات ہے ورنہ وہ استعداد یا وہ شاکلہ اور جوہر نفس جو منصب نبوّت

---

[1] ترمذی بروایت عبداللہ بن عمرؓ

کے لئے ضروری ہے وہ یہاں موجود تھا، اسی شرفِ خاص کا اظہار شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے یوں فرمایا کہ — جوہرِ نفس او در اشبہ جوہرِ نفس انبیاء آفریدہ باشد اہلِ ظاہر کا بڑا ظلم ہے کہ ان کمالات کو جو اس اعلیٰ ترین رُوحانی استعداد کا کرشمہ تھے حضرت عمرؓ کے مخصوص عقل و فکر کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور اپنی دانست میں ان کی تعریف کا حق بھی ادا کرتے ہیں - ؎ ایں نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

دستِ نبویؐ کی جلا بخشی

جوہرِ نفس کا اندازہ کچھ ہو چکا، اب نگاہ کا رُخ اس طرف کیجئے کہ یہ جوہر کس کے ہاتھوں سے ترش رہا ہے؟ ہادیٔ اعظم نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ایک اچٹتی نگاہ خذف کو نگین بنائے، وہ عمرؓ پر توجہ فرمائیں، زبان مبارک پر دعا ہے، دستِ پاک سے جلا بخشی ہو رہی اور تجلبِ فیض گنجینہ سے نورِ معرفت عطا ہو رہا ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اس وقت سِنِ شعور میں تھے، اپنے والد ماجد کی بارگاہِ رسالت پناہ میں اس پہلی حاضری کا ذکر یوں فرماتے ہیں -

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرب صدر عمر بن الخطاب بیدہ حین اسلم ثلاث مرات وھو یقول اللّٰھم اخرج مافی صدرہ من غل وبدّلہٗ ایماناً یقول ذلک ثلاثاً[۱]	تحقیق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن خطاب کے سینہ پر تین مرتبہ دستِ فیض پھیرا جب وہ اسلام لائے، اور تین بار یہ دُعا فرمائی کہ بارالٰہا اسکے سینے میں جو کھوٹ ہو اسکو دور فرما اور اسکے بجائے ایمان بھردے

جوہر بھی بے مثل اور جوہری بھی بے نظیر، نتیجہ یہ کہ آناً فاناً جہل وظلم گیا، علم وعرفان آیا، غفلت مٹی، حضوری ملی، اور ذاتِ حق سے وہ نسبتِ عالی اور ربط لازوال قائم ہو گیا جو صحابہؓ کے زمرہ عالی میں بھی اعلیٰ وارفع تسلیم کیا گیا - شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے الفاظ میں استعدادِ نفس خواب آلود تھی، پیغمبر کے جگانے سے جاگ اٹھی اور قوتِ عاقلہ میں جو وحی سے مشابہت ودیعت

تھی اور قوتِ عاملہ میں جو عصمت سے مشابہت رکھی گئی تھی، وہ اب نمایاں ہو گئی۔

زبان و قلب عمرؓ

چنانچہ اب حضرت عمرؓ کی زبان مبارک اور ان کا قلب اظہارِ حق کا معیار اور شناختِ حق کی کسوٹی بن گئے تھے، صحابہ کرامؓ کا ارشاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب عمر فاروقؓ کچھ فرماتے یا اُن کی رائے کسی جانب ہوتی تو "قرآن حضرت عمرؓ ہی کی رائے کے موافق نازل ہوتا" [1] خود محمد عربی (فداہ روحی) کا ارشاد بھی اس ضمن میں یہ رہا:

ان اللہ جعل الحق علی	اللہ تعالےٰ نے حق کو عمر کی زبان
لسان عمر وقلبہ [2]	اور قلب پر موقوف فرما دیا ہے

محدثیت یا موافقاتِ عمرؓ

علمائے ربانی نے ایسے پندرہ مواقع گنائے ہیں جن میں قرآن پاک نے بے غبار طور پر حضرت عمرؓ کی یا تو رائے کی تائید کی ہے یا ان کی حسب مراد آیت اتر آئی ہے یا لفظ بہ لفظ ان کا قول وحی الٰہی بن گیا ہے جو ان کی "محدثیت" کی کھلی دلیل ہے — طوالت سے بچنے کے لئے یہاں ان تین قسم کی تائیدات یا "موافقات" کی صرف ایک ایک مثال ملاحظہ ہو۔

۱ - رائے کی تائید — بدری قیدیوں کے متعلق صدیق اکبرؓ فدیہ لیکر چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے تھے اور عمر فاروقؓ ان کے قتل پر مصر تھے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان صدیق اکبرؓ ہی کی طرف تھا مگر وحی الٰہی جو آئی تو حضرت عمرؓ کی تائید لئے ہوئے — مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ ..... إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (انفال)

۲ - مراد کی تکمیل — آیت حجاب اترنے سے پہلے کاشانۂ نبوت میں ہر کوئی آتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کو یہ بات اچھی نہ لگی حضور نبویؐ میں عرض رسا

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب صحابہؓ فصل ثانی

ہوئے کہ یہ سلسلہ بند فرما دیا جائے اور ازواج مطہرات بھی پردے کے بعد باہر نہ نکلا کریں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مشورہ پر حکم الٰہی کے منتظر ہو کر خاموش ہو رہے۔ ایسے میں سورۃ احزاب کی آیت حضرت عمرؓ کے حسب مراد اتر آئی۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوهُنَّ مِن وَّرَاءِ حِجَابٍ۔

۳ - قول کی قبولیت) — عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ جب سورہ مؤمنون کی آیت "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ" نازل ہوئی تو ایک کیف عبدیت میں ڈوب کر زبانِ عمرؓ سے بے ساختہ نکلا —

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ — اور فوراً ہی جبرئیل امین اس قول کی مقبولیت کا مژدہ لے کر نازل ہوئے، حضور اکرمؐ نے فرمایا — "اے عمرؓ! جو فقرہ تمہاری زبان سے نکلا، وہی خدا نے بھی نازل فرمایا" اللہ اکبر! کیا الہام ہے کہ وحی متلو کا شرف پا گیا۔ یہ ہے "وحی الٰہی سے مشابہت" کی شان اور یہ ہے "قوت عاقلہ" کا وہ امتیاز جو خلفائے راشدین کا امتیاز تھا۔

معرفت الٰہیہ

حضرت عمرؓ کی فراست و فطانت کا اعتراف اپنے پرائے سب ہی کو ہے، اسی طرح ان کی "اولیات" یعنی جن امور کی پہل کا سہرا ان کے سر ہے، خواہ وہ مسائل دین سے متعلق ہوں یا تدبیر مملکت سے متعلق، ان کی فہرست بھی ایک منفرد نوعیت کی چیز ہے۔ سیرت فاروقی کے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کا حق علامہ شبلی نعمانیؒ نے خوب ادا کیا ہے اس لئے اسکی تفصیل تحصیل حاصل ہے یہاں صرف فاروق اعظم کی معرفت آگاہی یا ان کے "علم باللہ" اور اسکی عزلتِ خاص کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جلالتِ شان کو ذہن میں رکھئے اور پھر ان کے بچے تلے الفاظ کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کیجئے حضرت عمرؓ کی وفات پر فرماتے ہیں۔

لما مات عمر انی لاحسب	جب عمرؓ نے وفات پائی تو میں
انه قد ذهب تسعة	نے سمجھا کہ علم کا نو بٹے دسواں
اعشار العلم قيل له	حصہ چلا گیا، لوگوں نے کہا آپ
تقول هذا وفينا جلة	یوں کہتے ہیں حالانکہ ہم میں تمام

من الصحابۃ قال لیس	صحابہؓ موجود ہیں، فرمایا علم سے
اعنی العلم الذی	جو تم مراد لیتے ہو وہ میری مراد
تریدون وانما اعنی	نہیں بلکہ میری مراد ہے اللہ تعالیٰ
العلم باللہ تعالیٰ [1]	کی معرفت کا علم۔

اس سے پتہ چلا کہ یہ بات صحابہؓ کو بھی مسلم تھی "علم معرفت الٰہی" عام علم کتابی سے ایک الگ اعلیٰ و اشرف علم ہے، اور حضرت عمرؓ اس علم معرفت کے مہر درخشاں تھے اور یہ کہ حضرت عمرؓ تفقہ اور تدبیر مملکت کے کمالات ان کے اس علم معرفت سے کم رتبہ تھے، گو وہ بھی ہماری اصطلاحی عقل و فکر کے نتائج نہ تھے۔

خشیتِ الٰہی ہم نے آخری توضیحی مقدمہ میں بتایا ہے کہ تصوف اور احسان کا منتہا، مرضیٔ عبد، اور مرضیٔ حق میں یگانگت کا پیدا ہو جانا ہے اور حضرات صحابہؓ کی توصیف قرآن پاک میں اسی سے کی ہے کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ، مگر خود اس "رضائے صحابہؓ" کو خشیتِ الٰہی کا ثمرہ قرار دیا گیا ہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ، اب چونکہ حضرت عمرؓ صحابہ کرام کے زمرہ میں امتیازی شان کے مالک ہیں اس لئے ان کی سیرت میں صفت خشیت کا ظہور بھی خاص ہی ہونا چاہیئے، اور ہوا ان کی ایک ایک ادا خشیت الٰہی میں ڈوبی ہوئی تھی مگر عام طور پر ارباب سیر نے اس پہلو کو پوری طرح نہ دیکھا نہ دکھایا اور ہمارے لئے بھی اس پورے دفتر کا کھولنا مشکل ہے البتہ "مشتے نمونہ است از خروارے" چند باتیں پیش ہیں ان سے حضرت عمرؓ کے خوف و خشیت الٰہی کا اندازہ ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ یوں فرمایا کرتے تھے۔

لو مات جدی بطرف	اگر بکری کا بچہ فرات کے کنارے
الفرات رای شاطئہ	پر مر جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ

---

[1] ابن الجوزی سیرت عمرؓ

لخشیت ان یحاسب اللّٰہ بہ عمر [11] — اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ عمر سے نہ کر بیٹھے۔

اسی طرح عبداللہ بن عامرؓ کا قول ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور فرمایا۔

لیتنی لم اخلق، لیت امی لم تلدنی لیتنی لم اکن شیئًا، لیتنی کنت نسیًا منسیًا [12] — کاش میں پیدا نہ ہوتا، کاش میری ماں مجھ کو نہ جنتی، کاش میں کچھ نہ ہوتا۔ کاش میں نیست و نابود ہو گیا ہوتا۔

یہ ہے ایک خلیفہ راشد اور اس امیر المؤمنین کے خوف و خشیت کا حال جس کے رُعب و جلال سے کائنات لرزتی تھی۔ یہ عام سلاطین اور آمروں کی مصنوعی صولت و شوکت نہیں تھی بلکہ خاص ہیبت الٰہیہ کا اثر تھا جو ذاتِ عمرؓ پر چھا گئی تھی اور ظاہری حشم و خدم سے بے نیاز کل ماحول کو متأثر کر رہی تھی۔ بقول عارف رومیؒ

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

بہرکیف اس خشیت الٰہی کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو رات کو نیند میسر تھی نہ دن کا چین، دن کو رعایا کے حقوق کا خیال نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا اور رات کو اپنے نفس کے محاسبہ سے نیند اچاٹ ہو جاتی تھی خود فرماتے تھے:

اذا نمت فی اللیل ضیعت نفسی و ان نمت فی النھار ضیعت رعیتی [13] — اگر میں رات کو سو جاؤں تو میں نے اپنے نفس کو برباد کیا اور اگر دن کو سو جاؤں تو میں نے اپنی رعایا کا نقصان کیا۔

---

[12] سیرۃ عمر بن الخطاب از علی طنطاوی بحوالہ ابن الجوزی ۱۴۰ والریاض النضرہ ۲: ۵۴

[13] سیرۃ عمر بن الخطاب از علی طنطاوی بحوالہ تنبیہ المغترین للشعرانی ۴۸

اس خوف سے اس قدر رویا کرتے تھے کہ عبداللہ بن عیسیٰ فرماتے ہیں۔

کان فی وجہہ عمر خطان	حضرت عمرؓ کے چہرہ پر آنسوؤں
اسودان من البکاء[1]	کے بہنے سے دو سیاہ لکیریں
	پڑ گئی تھیں۔

اور خوف و خشیت کا اثر کچھ وقتی نوعیت کا نہ تھا بلکہ پورے دور حیات پر چھایا ہوا تھا۔ حتی کہ عین اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے حضرت عمر کو اسی کرب و بلا میں مبتلا یہ گڑگڑاتے ہوتے سنا گیا۔

ویلی وویل امی ان لم	بربادی ہے میری اور میری
یغفر اللہ لی[2]	ماں کی اگر اللہ نے مجھ کو نہ
	بخشا۔

یہ چند باتیں اظہار مدعا کے لئے بس ہیں تفصیل دیکھنا ہو تو سیرۃ عمر بن الخطاب — مؤلفہ شیخ علی الطنطاوی و ناجی الطنطاوی قابل دید ہے۔

احتساب نفس خشیت کا لازمی اثر احتساب نفس ہے، حضرت عمرؓ کے حکام اور رعایا پر احتساب نفس کے کارنامے بہت بیان کئے جاتے ہیں۔ مگر توجہ اس طرف بہت کم مبذول رہتی ہے کہ وہ خود اپنے نفس کے کتنے بڑے محتسب تھے۔ اس احتساب کا صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو — امیر المؤمنین ہیں، ایک روز ممبر پر چڑھتے ہیں، نظر ہر آن اپنے نفس پر جمی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیا تغیر محسوس ہوا کہ بھرے مجمع میں اپنے نفس پر زجر کرتے ہوئے فرمایا "ایک دن وہ تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور وہ اسکے عوض میں مٹھی بھر کھجور دے دیا کرتی تھیں اور آج میرا یہ زمانہ ہے"، بس یہ فرما کر ممبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے کہا یہ تو آپ نے اپنی تنقیص کی۔ فرمایا تنہائی میں میرے دل نے

---

[1] ایضاً بحوالہ الحلیہ ۱: ۵ [2] ایضا ابن سعد ۱: ۲۶۲ و ابن الجوزی ۱۹۹

کہا تم امیر المؤمنین ہو تم سے افضل کون ہو سکتا ہے اس لئے میں نے چاہا کہ اسکو اپنی حقیقت بتا دوں"۔ ؎۱

اظہار نعمت یا شکرانۂ فضیلت

اس احتساب کے ساتھ کسی عطائے ربانی کا اظہار کیا جائے تو وہ فَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے امرِ ربانی کی محض تعمیل ہے، اس نزاکت کو بجز ماہرینِ تصوف کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ پہچان سکتا ہے کہ اظہارِ فخر کیا ہے اور تحدیث نعمت کیا ہے؟ دیکھئے حضرت عمرؓ تخت خلافت پر آچکے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے مقدس مجمع سے مخاطب ہیں، اپنی اس فضیلت خداداد کا شکرانہ اور خلافت راشدہ کے مقام و منصب کا اظہار کس قدر صاف و صریح الفاظ میں فرما رہے ہیں۔

الحمد لله الذی	اس خدا کی تعریف جس نے مجھے
صیرنی بحیث لیس	ایسا بنا دیا کہ آج مجھ سے
فوقی احدٌ ؎۲	برتر کوئی نہیں۔

اس اظہار "لیس فوقی احدٌ" کو سنکر سب سر تسلیم خم کئے ہوتے ہیں اور سب کے سب حضرت عمرؓ کی ظاہری و معنوی، قالبی و قلبی، حکومتی اور روحانی فضیلت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں ورنہ اس مجمع مقدس کا ایک ایک فرد حق کے معاملہ میں اس قدر بیباک تھا کہ فوراً ٹوک دیتا کہ اے عمرؓ! تمہاری ظاہری برتری مسلم مگر باطنی پیشوائی کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ مگر جب کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا تو اپنے دور میں حضرت عمرؓ کی فضیلت ہر اعتبار سے ثابت ہو گئی اور معلوم ہوا کہ دور خلافت میں قاسم ازل اپنے عطا کی تقسیم انہیں کے ہاتھوں کرا رہا ہے، خواہ وہ مالِ غنیمت ہو یا انوار ولایت ہوں۔ اسی جامعیت کمال کی طرف شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ:

؎۱ نزہت الابرار۔ تذکرہ حضرت عمر۔ ؎۲ ارشاد الطالبین مصنفہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی بحوالہ دیلمی در فردوس و ابونعیم در حلیہ۔

"لوازم خلافتِ خاصہ آن است کہ خلیفہ افضل اُمّت باشد در زمانِ خلافتِ خود"

فرارِ شیطان

حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ نے خلافت راشدہ کے رُوحانی کمالات کے ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ——
"فرارِ شیطان از ظل او" — اور خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے متعلق تو ان کے اس وصف کی تصدیق خود نطقِ نبوی سے حاصل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

يا عمرؓ مالقيك الشيطان	اے عمرؓ جب شیطان تم سے
سالكاً فجاً الاسلك	کسی راستہ میں ملتا ہے تو
فجاً غير فجك ؎	راستہ بدل دیتا ہے

اس کے صاف معنی یہی ہوتے کہ مظہرِ ہدایت کے سامنے مظہرِ ضلالت کی کیا مجال ہے کہ ٹھہر سکے اور یہی بات ہم پورے زور و قوت سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ روحانی ترفع ہے کہ وہ ہدایت ربّانی کے مظہر بن گئے تھے اس لئے ان سے ہدایت ہی ہدایت پھیلتی رہی، اہلِ ظاہر کی نظر فاروقی کارناموں پر تو کچھ ہے بھی مگر نفس فاروقیت پر بالکل نہیں۔

اِصطلاح و محاورۂ تصوّف میں چند باتیں

اب تک ہم نے حتی الامکان اصطلاح اور محاورۂ فن سے بچتے ہوئے سیرت فاروقی میں تصوّف کے حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ اب کچھ اصطلاح میں گفتگو کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ "مراد" ہیں

اہل نظر کے نزدیک تو حضرت عمر کا امتیاز دورِ خلافت پر منحصر ہے مگر صوفیانہ نگاہ ان کے امتیاز کو قبلِ خلافت ہی نہیں بلکہ اُن کے اصل جوہر اور انکی ابتدا میں دیکھتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ اسلام میں "مرید" ہوکر نہیں آتے بلکہ "مراد" بن کر آتے ہیں، ان کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نے کھینچا ہے۔

حضورؐ نے ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ کہکر مانگا تھا۔

اللّٰھم اعزالاسلام	اے اللہ ابوجہل اور عمر بن
باحب ھذین الرجلین	خطاب میں سے جو تجھے محبوب
الیک بابی جھل او عمر	ہو اس سے اسلام کو عزت
بن الخطاب [1]	دے۔

چنانچہ جب اس دعا کی قبولیت نے ظہور کیا اور نگاہ رب العزت میں عمر بن خطاب ہی محبوب ٹھہرے اور انہی کے ذریعہ دین کی عزت افزائی مقدر ٹھہری تو ابن ماجہ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے پر جبرئیل علیہ السلام آئے اور بارگاہ نبوت میں عرض کی کہ "آسمان کے لوگ آپ کو عمر کے اسلام لانے پر بشارت دیتے ہیں"۔ "مرادیت عمرؓ کی یہ کس قدر کھلی اور مستحکم دلیل ہے۔

حضرت عمرؓ "مجذوب سالک" ہیں

فن سلوک و تصوف کے واقف کار جانتے ہیں کہ جو "مراد" ہوتا ہے اس کو دولت "جذب" پہلے ملتی ہے اور مدارج سلوک کی سیر بعد میں کرائی جاتی ہے، یہی "محبیت" کی نشانی ہے اور اسی کو اصطلاح میں "مجذوب سالک" کہا جاتا ہے، لہذا حضرت عمر بھی مجذوب سالک ہوئے، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحؒ نے پوری صراحت سے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو "سالک مجذوب" ہیں مگر بقیہ تینوں خلفاءؓ کا حال یہ ہے

فان جذبھم مقدم علی	یعنی ان حضرات (ثلثہ) کا جذب
سلوکھم کما ھو	ان کے سلوک پر اس طرح مقدم
حال حضرۃ الرسالۃ	ہے جیسے خود حضرت رسالت
المصطفویہ	پناہ صلے اللہ علیہ وسلم کا
علیہ وعلی آلہ الصلوات	حال ہے۔
والتسلیمات [2]	

---

[1] ترمذی بروایت عبداللہ ابن عمر [2] معارف لدنیہ معرفۃ ۲۲

حضرت عمرؓ "قدم موسیٰ" پر

یہ تو سب ہی مانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ابراہیمیت موسویت اور عیسویت والی جامعیت کا خاص شرف حاصل ہے۔ البتہ حضور اقدس ہی کے فیضان روحانی سے پچھلے انبیاء کی طرح اگلے اولیاءِ کاملین میں بھی کسی میں حضرت نوح والے غیظ و غضب کا جلال، کسی میں موسوی حکومت و سطوت کا شکوہ، کسی میں عیسوی زہد و عفو کا جمال نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔ صوفیاء کرام اپنی بولی میں افراد اُمت محمدیہ کے ان شئون کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ "قدم نوح" پر ہیں، فلاں "قدم موسیٰ" پر اور فلاں "قدم عیسیٰ" پر۔ صوفیاء کے اس نقطۂ نظر سے سیرت عمر کا جائزہ لیا جائے تو اس میں یہ تمام خشیت و زہد، تنظیم ملّت، حکومت و سطوت اور جاہ و جلال کی خصوصیت اسقدر نمایاں نظر آتی ہے کہ ہم بلا پس و پیش یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ "قدم موسیٰ" پر ہیں — اور یہ بات کم از کم حضرات شیخینؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کے بارے میں تو محض صوفیاء کے کہنے کی نہیں ہے بلکہ نطق نبوی سے اسکی کھلی تائید مل جاتی ہے۔ دیکھئے غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے اور حضرت عمر نے کہا کہ انہیں قتل کر دیا جائے لیکن حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں ان پہ رحم فرمائیے۔ آپ نے ان مشوروں کو سُنکر فرمایا کہ ایک فریق (یعنی ابن رواحہ و عمر) اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ اور موسیٰؑ کی طرح ہے۔ نوح نے کہا، پروردگار! زمین پہ کافروں میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ اور موسیٰ نے کہا ہمارے پروردگار! ان کی دولت ملیا میٹ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے اور دوسرا فریق (یعنی ابوبکر) ابراہیم کی طرح ہے، ابراہیم نے کہا جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے نافرمانی کی تو تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور عیسیٰ کی طرح ہے کہ عیسیٰ نے کہا اگر تو نے ان کو

سزا دی تو وہ تیرے بندے ہیں اور تو معاف کر دے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے (مستدرک حاکم - ۳ ص ۲۱ و ص ۲۲) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عبداللہ بن رواحہ اور حضرت عمر کو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ کی نذیری شان اور حضرت ابوبکر کو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ کی بشیری شان کی مثال میں ظاہر فرمایا'' ؎

حضرتِ عمرؓ ''قطبِ ابدال'' تھے

حضرت عمرؓ کا قدم موسیٰ پر ہونا ثابت ہو چکا اور یوں بھی چشم بصیرت پر ظاہر ہی تھا لیکن اگر سوال یہ کیا جائے کہ خود نبی آکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں آپ کا روحانی رتبہ کیا تھا، تو اس کا جواب حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے ملے گا، اپنے مشہور رسالہ معارف لدنیہ میں معرفت (۳۵) کے تحت حضرت مجدد نے پہلے تو ''قطب ارشاد'' اور ''قطب ابدال'' کے فرق کو واضح فرمایا ہے کہ ایمان، ہدایت، نیکیوں کی توفیق، برائیوں سے توبہ: یہ ''قطب ارشاد'' کے فیوض کا نتیجہ ہیں اور قطب ارشاد ''قدم نبوی'' پر ہوتا ہے اس کے بالمقابل ''قطب ابدال'' دنیا کے تکوینی امور جیسے بلاؤں کا ازالہ، امراض کا خاتمہ، حصول عافیت اور رزق رسانی وغیرہ کا ذریعہ ہوتا ہے اور اسکو پل بھر کی فرصت نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ مشغول ہی رہتا ہے - اس فرق کی وضاحت کے بعد دورِ حضرت رسالت پناہ ؐ میں عمر فاروق رضؓ کے مقام باطنی سے متعلق یہ عجیب انکشاف فرمایا ہے -

وقد کان صلی اللہ علیہ وسلم قطب الارشاد وکان قطب الابدال فی ذلک الوقت عمرؓ واویس القرنی رضؓ	خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو قطب ارشاد تھے اور اسی دور میں عمرؓ اور اویس قرنی رضؓ قطب ابدال تھے -

---

؎ خلیل اللہ کی بشریت — حضرات انبیاء کے اوصاف غالبہ'' از علامہ سید سلیمان ندوی رحؒ

تجدید دین کا کارنامہ "نسبت فاروقی" کے ذریعے انجام پاتا ہے

رد و قبول اہل بصیرت پر چھوڑتے ہوئے مکتب "تصوف و احسان" کے ابجد خوان کی حیثیت میں "نسبت فاروقی" سے متعلق ایک غور طلب بات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر نسبت کا ایک لون (رنگ) ہوتا ہے اور جب کبھی کسی خاص نسبت کا ظہور کہیں ہوتا ہے تو اس صاحب نسبت سے اسی رنگ کے مخصوص کمالات ظاہر ہوتے ہیں اور نسبتوں کے ان الوان کے اشارات خود احادیث نبویہ سے ملتے ہیں مثلاً حضرات نقشبندیہ جو نسبت صدیقی کے حامل ہیں ان میں سینہ بہ سینہ القاء کا ظہور زیادہ ہے اس کا اشارہ اس ارشاد نبوی میں صاف ملتا ہے کہ :

ما صب اللہ فی صدری	اللہ تعالےٰ نے میرے سینہ میں
شیأً الا صببتہ فی	کوئی بات ایسی نہیں ڈالی جو
صدر ابی بکرؓ	میں نے ابوبکر کے سینہ میں
	ڈال نہ دی ہو۔

یا مثلاً حضرات چشتیہ جو نسبت علوی کے حامل ہیں ان میں فنائیت کا کمال بہت زیادہ ہے۔ یہ فیض عینیت کا اثر ہے۔ جس کا اشارہ اس حدیث پاک میں ملتا ہے کہ :

علیؓ منی وانا منہ	علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علی
	سے ہوں۔

اسی طرح اگر غور کیا جائے تو فاروق اعظمؓ کے بارے میں جو خاص ارشادِ نبویؐ ہے وہ یہ ہے کہ :

لو کان بعدی نبیٌّ	میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ
لکان عمر۔	عمر ہوتے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظام شرعی کی ترویج و تجدید کے کارنامے کا خصوصی تعلق "نسبت فاروقیؓ" ہی سے ہے، اور جب کبھی "نسبت فاروقی"

کا فیضانِ خاص کسی ولی پر غالب آتا ہے تو اس سے تجدید دین کا کارنامہ سرانجام پاتا ہے خواہ وہ کسی کو نقشبندی ہو یا چشتی یا قادری یا سہروردی[1]

اس حقیقت کے ماسوا تاریخ مجددین پر سرسری نظر ڈالئے تو "اتفاقِ مشیئت" کا ایک اور کرشمہ نظر آئے گا وہ یہ کہ دینِ محمدیؐ کے مجدد اوّل اور پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز ہیں جو نسبت باطنی رکھنے کے علاوہ فاروق اعظمؓ کے پرپوتے بھی ہیں - پھر ہزارہ ثانی کے مجدد اوّل حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ جن کا نام نامی ہی "مجدد الف ثانی" پڑ گیا ہے، وہ بھی فاروقی النسب ہی ہیں - بارہویں صدی کے مجدد کبیر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ بھی نسباً فاروقی ہی تھے — اسی طرح چودھویں صدی میں دین محمدیؐ کے ایک اور ممتاز مجدد یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ بھی نسباً فاروقی ہی ہیں — ان چار ہستیوں کے علاوہ درمیانی صدیوں کے مجددین کی جو فہرستیں امام جلال الدین سیوطی یا اور محدثین نے مرتب فرمائی ہیں، ان میں سے ایک ایک کو دیکھا جائے تو اور بھی ہستیاں ایسی نکل آئیں گی جن میں فاروقی خون جوش زن ملے گا - گو ہمارے نزدیک تجدیدی کارنامے کا انحصار نسب پر نہیں بلکہ محض "نسبت فاروقی" کے زور پر ہے - واللہ اعلم وعلمہٗ اتم -

---

[1] واضح رہے کہ علوی، صدیقی، فاروقی، عثمانی یا اویسی نسبتوں کا ظہور معروف سلاسل تصوف میں کسی خاص سلسلہ کا پابند نہیں، بلکہ یہ تجلیاں ہر سمت کو ندتی رہتی ہیں، در اصل اس کا انحصار کسی اہل اللہ کے اپنے شاکلہ پر ہے - اس کی نہایت عام فہم مثال حضرت حکیم الامت رحؒ نے یہ ارشاد فرمائی ہے کہ مرغی کا انڈا اگر بطخ کے نیچے رکھیئے تو مرغی برآمد ہوگی - بطخ کے سینکنے سے بطخ برآمد نہ ہوگی - اسی طرح اس کے برعکس معلوم ہوا کہ دارومدار انڈے کی طبعی استعداد پر ہے نہ کہ مرغی یا بطخ کی حرارت پر — !!

[2] مجدد چہاردہم صدی کے تجدیدی کارنامہ کو ایک نگاہ میں دیکھنا ہو تو حضرت مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کی چار گرانقدر مؤلفات، تجدید دین کامل، تجدید تصوف، تجدید تعلیم و تبلیغ اور تجدید معاشیات کا مطالعہ ضروری ہے، راقم الحروف نے عارف باللہ حضرت مولانا محمد حسین چشتی حیدرآبادؒ قدس سرہٗ (مرشد حضرت مولانا گیلانیؒ) کو اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵ پر)

قرآنِ عظیم کی زبان

محمد خورشید (ہوسٹن۔امریکہ)

عربی نہ صرف القرآن الکریم کی زبان ہے، بلکہ وہ زبان ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے خصوصاً اس لئے تخلیق کی، پروان چڑھائی، اور مکمل کی، کہ بالآخر قرآن مُبین، انسانیت کے لئے اللہ کا آخری قانون، اس زبان میں مدوّن کیا جانا تھا۔ دُنیا میں کتنی ہی زبانوں نے رواج پایا اور ختم ہوگئیں، کئی نئی زبانیں امتداد زمانہ سے ترویج پائیں گی، خود اُردو زبان چار سو سال پہلے دنیا میں موجود نہ تھی۔ بے شمار زبانیں کرۂ ارض پر آج بھی مرّوج ہیں، لیکن کسی زبان میں نہ اس بات کی سکت ہے نہ قوت کہ وہ قرآنی الہام اور قانون کو اپنے اندر سمو سکے۔ یہ خصوصیت عربی اور صرف اِسی زبان کو حاصل ہے، کہ وہ قرآنی مفہوم کو نہ صرف قائم رکھتی ہے، بلکہ تاقیامت اس مفہوم کو بڑی سادگی اور راستگی کے ساتھ قائم رکھے گی۔ اور یہ سب اس لئے ممکن ہے کہ اس زبان کو اللہ تعالےٰ نے اپنی نگرانی اور حفاظت میں مکمل کیا۔ چند مثالیں اس ادّعا کو زیادہ واضح کر سکیں گی۔

عربی زبان میں فعل المضارع حال اور مستقبل دونوں زمانوں کو بیان کرتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی فعل المضارع استعمال ہوا ہے، اگر اُس کے معانی کو س، سوف، کان، وغیرہ کے الفاظ سے محدود نہیں کیا گیا تو دونوں ہی زمانے، حال اور مستقبل، بیان ہو رہے ہیں اور اگر ہم قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو دونوں ہی زمانوں کو بیک وقت زیرِ نظر رکھنا پڑے گا۔ قرآنی الفاظ:

(۱) یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ۔ (۲) یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ،
(۳) مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ، وغیرہ کا مطلب ہے ؛

(۱) وہ اس وقت غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور آئندہ بھی اُن کا غیب پر ایمان رہے گا، جب تک وہ مومن ہیں۔

(۲) وہ الصلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور اُسے قائم رکھیں گے جب تک کہ وہ مومن ہیں

(۳) وہ اپنے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مومن ہیں۔

اسی طرح یَکْفُرُوْنَ کا مطلب ہے، وہ اس وقت کافر ہیں اور کافر ہی رہیں گے، جب تک وہ اپنے کفر کا انکار نہ کر دیں۔

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی جملہ میں ایسا فعل لانا چاہتا ہے۔ جس سے تینوں زمانے، ماضی، حال اور مستقبل، بیک وقت مراد ہوں۔ آپ دو دو تین تین، چار چار زبانوں سے واقف ہوں گے۔ اگر آپ ان زبانوں پر ایک اجمالی نظر بھی ڈال کر دیکھیں گے، تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ کسی زبان میں، کہیں بھی، ایسا فعل موجود نہیں جس کے استعمال سے تینوں زمانے، ماضی، حال اور مستقبل، بیک وقت مراد لئے جا سکیں، اور آپ یہ بھی اعتراف کریں گے کہ کسی زبان میں بھی جملہ اُس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں کوئی فعل استعمال نہ کیا گیا ہو۔

عربی زبان میں اللہ تعالےٰ نے اس بات کا انتظام اس صورت سے کیا کہ جب بھی مقصد یہ ہو کہ جملے میں تینوں زمانے، ماضی، حال اور مستقبل، بیک وقت پائے جائیں، تو فعل استعمال ہی نہ کیا جائے اور جملہ پھر بھی مکمل ہے اس طرح عربی کا ہر وہ جملہ جس میں فعل استعمال نہیں ہوا، ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر بیک وقت حاوی ہوگا، مثلاً:

۱۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

۲۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

۳۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

۴۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

۵۔ اَللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ

ان جملوں کا سادہ ترین ترجمہ یہ ہوگا -

۱ - وہ دین جو اللہ کو منظور تھا - منظور ہے، اور ہمیشہ منظور رہے گا، صرف اسلام ہے -

۲ - اللہ آسمانوں اور زمین کا نور تھا، اب بھی آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اور آئندہ بھی ہمیشہ آسمانوں اور زمین کا نور رہے گا -

۳ - اللہ ہمیشہ الحی القیوم تھا، آج بھی الحی القیوم ہے، اور ہمیشہ الحی القیوم رہے گا -

۴ - اللہ کے علاوہ نہ کوئی الٰہ تھا، نہ ہے، نہ کبھی ہوگا، محمدؐ اللہ کے رسول تھے، اب بھی ہیں اور ہمیشہ اللہ کے رسول رہیں گے -

۵ - اللہ عزیز ذو انتقام تھا، اب بھی ہے، اور ہمیشہ عزیز ذو انتقام رہے گا -

آپ ان عربی جملوں کی ساخت کو دیکھئے تو پہلی نظر سے ہی آپ کہہ اٹھیں گے کہ دنیا کی کسی اور زبان میں اتنی سادگی اور اتنے اختصار سے اتنی بھرپور بات نہیں کی جا سکتی - پہلے اور دوسرے جملہ میں پانچ لفظ ہیں، تیسرے اور چوتھے میں سات سات اور پانچویں میں صرف چار - آپ ان جملوں کے مضمون کو ہر اُس زبان میں جو آپ جانتے ہیں ادا کرنے کی کوشش کیجئے لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ آپ تینوں زمانوں - ماضی، حال اور مستقبل، اور جملہ کے پورے مفہوم کو ادا کریں - کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اُتنے ہی یا اُن جملوں کے تقریباً برابر الفاظ میں یہ بات پیدا کر سکتے ہیں؟ یہ ہو نہیں سکے گا، اور ہرگز نہیں ہو سکے گا - اسی لئے تو اللہ تعالےٰ نے عوام الناس کو چیلنج کیا:

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ - - - - - - البقرہ ۲۳

بات کتنی سادہ ہے، لیکن کتنی اہم - نہ کسی زبان کی قید ہے نہ کسی زمانے کی، اور وہ چیلنج آج بھی کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا - ہر زمانے کے خواص اور عوام الناس کو اس لئے للکارا گیا ہے کہ عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں

قرآن کی مثال لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور خود عربی زبان میں، جو اللہ کی نگرانی میں تکمیل شدہ زبان ہے، خود عرب اس کی مثال اس لئے نہیں لاسکتے کہ انسانی انشا پردازی میں خود عرب انشاء پردازوں سے وہی ادبی سقم پیدا ہو جائیں گے جو ہر انسانی انشا پردازی کا حصّہ ہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ کی تیار کردہ زبان میں خود اللہ سبحانہ وتعالےٰ ہی آپ سے اور مجھ سے کچھ کہے، جو اُس نے قرآن میں کہہ دیا ہے - اور چونکہ عربی اللہ کی اپنی زبان ہے اس لئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ آخرت میں ہر انسان کی زبان عربی ہوگی، دُنیا میں چاہے وہ کوئی زبان بھی استعمال کرچکا ہو -

ایک اور مثال سے بات زیادہ واضح ہوجائے گی اللہ جل شانہ کا قول ہے:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا - النساء ۴۷، الاحزاب ۳۷

اللہ کا امر تو ایک مکمل شدہ چیز ہے -

اب چونکہ اللہ کا 'امر' پہلے ہی سے مکمل شدہ ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ عربی زبان، جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی نگرانی میں مکمل کیا، اس نہج پر تیار کی گئی کہ اُس زبان میں ہر 'فعل' اور میں دہراتا ہوں کہ ہر فعل، ماضی میں ہے، واحد ہے اور غائب کے صیغہ میں ہے، مثلاً

اَمَرَ، كَتَبَ، فَعَلَ - عَلِمَ، ذَكَرَ،

یہ سب کہہ رہے ہیں -

اُس نے حکم دیا، اُس نے لکھا، اُس نے کیا - اُس نے جانا - اُس نے ذکر کیا

کیا یہ سب کچھ ہمیں انگشت بدنداں نہیں چھوڑ دیتا کہ عربی زبان کی اندرونی خوبیاں اتنی گہری، اتنی ہمہ گیر، لیکن پھر بھی اتنی سادہ اور عیاں ہیں کہ سمجھنے والے پر وارفتگی طاری ہوجاتی ہے -

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ - الرعد ۴

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اِس زبان میں اپنا قانون آخری شکل میں بنی نوع انسان کے حوالہ کرنا تھا - وہ قانون اور وہ ہدایت

جیسے قیامت تک انسانوں کے پاس اِس طریقے سے رہنا ہے کہ اُس میں سرِمُو تبدیلی نہ ہوسکے - نہ صرف یہ کہ اُس کے الفاظ میں تبدیلی نہ ہوسکے - بلکہ اُس کے مفہوم میں بھی کہیں شک وشبہ یا ابہام کا شائبہ بھی نہ مل سکے - دنیا کی کوئی مروج یا غیر مروج زبان اس کی متحمل نہیں ہوسکتی - یہ بات عربی اور صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ نے اُسے تیار ہی اس مقصد کیلئے کیا تھا، اسی لئے اللہ نے اس کی مزید تصدیق یہ کہہ کر کردی - :

(۱) وھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ... ... النحل ۱۰۳

(۲) بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ... ... الشعراء ۱۹۵

ترجمہ:

(۱) یہ عربی زبان ہے صاف، سادہ، عام فہم، جس کے مفہوم میں ابہام نہیں ہوسکتا - (مبین)

(۲) عربی زبان میں جو مبین ہے، یعنی جس میں مطلب اور معنی کا اختلاف ہے ہی ناممکن، کیونکہ وہ واضح ہے، سادہ ہے، پُرکاری سے خالی ہے، اور قانون الٰہی کی زبان ہے، لہٰذا حد درجہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے تاکہ کوئی یہ بہانہ نہ بنا سکے کہ اے اللہ میں تو بس سادہ زبان پڑھ لکھ سکتا تھا، اتنی مشکل زبان کیسے سمجھتا -

عربی کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ نے سورۃ النحل میں دُنیا کی دوسری تمام زبانوں کے لئے کہا کہ وہ عجمی ہیں - اگر آپ عربی زبان کی کسی بھی ڈکشنری اور قاموس میں دیکھیں گے، تو 'عجمی' کے معنی آپکو ملیں گے وہ زبان جسے سمجھنے میں دشواری ہو، اوپری بات، وہ بات جو صاف اور واضح نہ ہو Obscure Incomprehensible Unintelligible

ظاہر بات ہے اللہ کے قانون کی آخری کتاب کسی ایسی زبان میں نہیں لکھی جاسکتی تھی جو خود عجمی ہو، جس میں مطالب ومفہوم میں ابہام بھی آسکے، جہاں اختلاف کا امکان بھی ہوسکے، جو شک وشبہ کو بھی جگہ دے سکے، آیا قانون کا مطلب یہ ہے یا کچھ اور -

چونکہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر قرآن دنیا کی کسی بھی اور زبان میں اتارا گیا، تو ابہام لازمی ہے، پیچیدگی عیاں ہے، دامانِ لسان کی واماندگی اور افتادِ ظاہر ہے، اس لئے اللہ عربی کے علاوہ کوئی اور زبان اس لئے بھی منتخب نہیں کی ـــ کہ کسی بھی عجمی زبان میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ قانون کے معنی بدل جانے کا امکان ہے، ابہام ممکن ہے، اشکال پیدا ہو جائے گا، اور اگر قانون میں کہیں بھی ایسا جھول آ جائے تو اُمتِ مسلمہ پارہ پارہ ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ نے اپنے قانون کی آخری شکل اور ہدایت کے لئے عربی کا انتخاب کیا۔ یہ صحیح ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو وحی اُنکی اپنی زبان میں دی گئی، لیکن عربی زبان میں قرآن کے نازل ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ حضورؐ عربی زبان بولتے تھے، بلکہ اللہ کی مشیئت یہ تھی کہ عربی زبان کو اُس خطہ میں پروان چڑھایا جائے، جہاں اللہ کی یہ زبان دُنیا کی ہر زبان کی آمیزش اور آلودگی سے پاک رہے، یہ اپنے طور پر واحد زبان ہو، اس کا اپنا آہنگ ہو، اس کا اپنا انفرادی انداز ہو، تاکہ جب اس میں قرآن نازل کیا جائے تو کسی کو یہ شکایت نہ ہو سکے کہ ان آیات سے دو یا دو سے زیادہ مطالب بھی نکل سکتے ہیں (اور اگر نکل سکتے ہیں تو سارے مطالب اللہ کو یک وقت مطلوب ہیں)، یا یہ زبان ثقیل ہے، یا اس زبان میں صَرف و نحو کی پیچیدگیاں اس قدر ہیں کہ ایک عام آدمی کے لئے قرآن سمجھنا مشکل کام ہے۔

اس ضمن میں دو باتیں پیشِ نظر رکھیئے :

(۱) عربی واحد زبان ہے جو حضورؐ کی بعثت کے وقت نہ صرف مکمل تھی بلکہ نزولِ قرآن کے صدیوں بعد تک اس زبان کے کوئی قواعد (Grammar) بھی موجود نہ تھے، نہ اس کی ضرورت تھی۔ صَرف اور نحو، قواعد و گرامر (Grammar) کا آغاز تو بنو عباس کے دور میں اُس وقت شروع ہوا جب مسلمانِ عرب علماء و ادباء نے یونانی علم و ادب کو عربی کے سانچے میں ڈھالا۔ مختلف ترجموں کے ذریعہ مسلمان بھی افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ خیالات سے آشنا ہوتے، عجمی زبانوں کے قواعد سے واقفیت حاصل ہوئی تو وہ منطق اور

استدلال جو انہوں نے یونانی فلاسفہ سے سیکھا، اُس کی روشنی میں مسلمانوں کو بھی عربی زبان کو قواعد، صرف اور نحو کے سانچوں میں ڈھالنے کی سوجھی تاکہ یہ زبان جس کے بظاہر کوئی قواعد موجود نہیں، 'مہذب' زبانوں کے مقابلے کی زبان بن جائے۔ اور یوں فلک الافلاک جیسی وسعت رکھنے والی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اپنی مکمل کردہ عربی زبان کو خود مسلمانوں نے صرف و نحو کی وہ بیڑیاں پہنائیں جن میں نہ صرف زبان جکڑی ہوئی ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں کے افکار و تدبر بھی زیرِ حراست آگئے اور یوں دنیا کی سب سے زیادہ سائنٹیفک (Scientific) اور وسیع زبان کا دامن خود مسلمانوں کے ہاتھوں اتنا تہی داماں ہوا کہ آج معمولی علمی اور سائنسی الفاظ جو مغربی زبانیں، انگریزی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی، وغیرہ استعمال کرتی ہیں، عربی زبان سے کو اُن زبانوں سے مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس جب قواعد موجود نہ تھے، تو دنیا کی تمام زبانوں کے علوم، ادب، سائنس، ریاضی، فلکیات، طب، نفسیات، انجینئرنگ، غرضیکہ ہر شعبہ کے علوم و افکار اسی عربی زبان میں نہ صرف ترجمہ ہوتے، بلکہ متعدد اصل (Original) مقالے اور افکار و آراء عربی میں لکھے گئے، شائع ہوتے رہے، اور پھر عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کئے گئے۔

عصرِ جاہلیہ کے ادب پر نظر ڈالیں گے تو آپکو عربی نثر کہیں نظر نہ آئے گی، عربی نظم البتہ اپنے عروج پر تھی۔ شعراء کا بول بالا تھا اور عربی شعر و شاعری نے وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ جب قرآن کا جستہ جستہ نزول شروع ہوا، تو عوام الناس، جو قرآن کی اصلیت سے بے خبر تھے، اُسے بھی شعر، بلکہ بہت اونچے درجہ کا کلام سمجھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے نوازجر و توبیخ سے کام لیا:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (یٰسٓ ۷۰-۶۹)

قرآن کی زبان اتنی سادہ اور انداز اتنا دلنشیں تھا کہ جو سنتا تھا، اُس کے دل میں گھر کر لیتا تھا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لہٰذا معاندین نے فورًا اپند باندھے کہ یہ تو کھلا جادو ہے، سحر مبین ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا، قَالُوا إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ۔ یونس ۷۶

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ۔ الزخرف ۳۰

فَقَالَ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۔ (المدثر ۲۴)

اللہ جل شانہٗ نے ایسے لوگوں کو وہیں ڈپٹا کہ یہ سحر نہیں ہے، جادو نہیں ہے، انسانوں کے لئے اللہ کا ذکر ہے، قانون ہے، ہدایت ہے:

وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ۔ (المدثر ۳۱)

اللہ کی مشیئت یوں تھی کہ ایک خاص خطۂ زمین میں قرآن کی زبان کی ترویج کی جائے، جسے اُس نے عربی کا نام دیا، اور آل اسماعیل کو وہاں لا بسایا بلکہ آلِ اسمٰعیل سے عربی زبان کی ابتدا ہوئی۔ پھر آل اسمٰعیل ہی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خاتم النبیینؐ کے طور پر مبعوث فرمایا، تاکہ آپؐ عربی زبان کے بولنے والے ہوں اور پھر قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل فرمایا۔ بلکہ جس پر نازل فرمایا اُس نے اپنے لئے فرمایا: انا افصح العرب (میں عربوں کا فصیح ترین انسان ہوں)، تاکہ دُنیا کے کسی خطے میں، وقت کے کسی دور میں، کسی انسان کو اللہ کی آخری ہدایت اور آخری قانون کو سمجھنے میں کوئی دشواری ہرگز نہ پیش آئے اور وہ اس قانون کو پڑھتے ہی اُس کے صحیح مفہوم میں اپنا ایمان بنا لے اور پھر اُسی کے مطابق اس کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی، اُس کی انفرادی موت اور اجتماعی موت واقع ہو۔

فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۔ (البقرہ ۱۳۲)

چونکہ اس قانون اور ہدایت کا سمجھنا حد درجہ آسان تھا، اور یہ خدشہ تھا کہ امتدادِ زمانہ سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش

کریں گے کہ قرآن کا سمجھنا تو بہت مشکل کام ہے، اس لئے اُسے ہم سے سمجھو تو اللہ جل شانہٗ نے دوٹوک اور برملا یہ اعلان کر دیا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ - (القمر ۱۷)

اور اسے اُسی سورہ میں بار بار دہرا بھی دیا تاکہ کسی انسان کا یہ گمان زیادہ دیر تک قائم نہ رہے کہ قرآن کا سمجھنا واقعی مشکل کام ہے۔

اور چونکہ قرآن کے نازل کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ لوگ اس قانون کو سمجھیں، اس کی اطاعت کریں، دُنیا میں امن قائم کریں، اور اس اطاعت سے دین و دنیا کے فائدے جھولیاں بھر بھر کر سمیٹیں، اسی لئے ساتھ ہی کہہ دیا

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ -

(الزخرف ۳)

اللہ تعالےٰ کی ذات خود قرآن مبین کی قسم کھا کر یہ کہہ رہی ہے کہ بیشک ہم نے قرآن عربی میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم اب اسے سمجھ لو اور آئندہ بھی اس سے عقل حاصل کرتے رہو، (تعقلون، فعل المضارع، حال اور مستقبل دونوں) دیکھا آپ نے قرآن کو عربی میں نازل کرنے کا اللہ کا استدلال۔ قرآن کو عربی میں اس لئے نازل کیا کہ یہ قانون ہے، اسے صحیح مفہوم پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ عربی زبان میں ہو، اسے عقل عیار کی مکاریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ عربی زبان میں ہو، اسے فکر اور تدبر سے سمجھنے کیلئے لازمی ہے کہ یہ عربی زبان میں ہو۔

اسی بات کو ایک اور انداز سے سمجھانے کے لئے کہ قرآن عربی زبان میں کیوں اتارا گیا، سورہ رعد میں اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ نے فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (الرعد ۳۶-۳۷)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کا عبد رہوں اور اُس کے ساتھ کسی قسم

کا شرک ہرگز نہ ہونے دوں۔ میں تم سب کو بھی صرف اسی بات کی دعوت دیتا ہوں اور ہم سب بالآخر اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، اور صرف اس مقصد کے لئے (کذالک) اللہ کا حکم، قانون، ہدایت عربی زبان میں دی گئی ہے"۔

آپ اور میں جانتے ہیں کہ کسی بھی قانونی ضابطہ میں، کوئی بھی قانون، جتنے سادہ الفاظ میں لکھا ہوگا، اُس میں جتنا کم ابہام ہوگا، وہ جس قدر عام فہم نہیں بلکہ عوام فہم ہوگا، اتنا ہی اُس پر صحیح عمل آسان ہوگا اور اتنی ہی اُس میں میخ نکالنی مشکل ہوگی۔ اسی لئے اللہ نے کہا کہ صرف اسی مقصد کے لئے (کذالک) میں نے اپنا حکم، عربی زبان میں تمہیں پیش کیا ہے۔ تاکہ تمہارے لئے اس میں کوئی اپیچ پیچ نہ ہو، تمہیں یہ نہ کہنا پڑے کہ ہمیں تو سمجھ میں نہ آسکی لہ تیرے حکم کا اصل منشاء کیا ہے اور تاکہ کسی زمانہ میں بھی کوئی گروہ یا فرد بھی چاہے وہ اُس "حکم" کے حق میں ہو یا خلاف، اس حکم کے مدعا اور حدود Scope پر نہ پردہ ڈال سکے، نہ اُن کا غلط مطلب نکال سکے۔ یہی نہیں۔ توحید اور شرک کا فرق اگر مکمل طور پر اور صحیح طور پر سمجھنا ہے تو یہ صرف عربی زبان ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ (جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآنی ادب و ثقافت کا ایک پہلو

پروفیسر حافظ احمد یار

قرآن کریم بنیادی طور پر کتاب ہدایت ہے اور اس کا اصل موضوع عقیدہ اور شریعت ہے تاہم ادب و لغت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی قرآن کریم بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ اعجاز القرآن کے ضمن میں قرآن کریم کی تحدی کو زیادہ تر اسی فصاحت و بلاغت کے پہلو سے ہی سمجھا سمجھایا جاتا رہا ہے۔ کم از کم نزول قرآن کے معاصرین کے سامنے قرآن کے اس چیلنج کا مفہوم یقیناً یہی تھا۔ دوسرے پہلو (جن کا ذکر متاخرین اور ہمارے معاصرین کی تالیفات میں ملتا ہے) تو تاریخ کے عمل اور انسانی علوم کی وسعت کے ساتھ ساتھ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

قرآن کریم نے عربوں اور مسلمانوں کے علوم و آداب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ قرآن اور حدیث جب اذہان اور افکار میں راسخ ہوئے۔ تو اہل عرب کی قدیم عادات اور رسوم کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی و لسانی ذوق کی بھی تہذیب و تطہیر ہوئی۔ قرآنی اسلوب کے تتبع میں اب شعر میں بھی غریب اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا جانے لگا۔ ہجو تک میں فحش گوئی اور خلاف تہذیب عناصر سے پرہیز کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس قرآنی الفاظ اور اسالیب و تراکیب اور نئی تعبیریں زبان میں بکثرت استعمال ہونے لگیں۔ خطابات میں ــــــ اسالیب قرآن اور آیات و احادیث کے اقتباسات سے کام لیا جانے لگا۔ جو خطبہ قرآنی آیات سے خالی ہوتا مسلمان اسے "شوھاء" (منحوس) کہتے تھے۔ آیات کے اقتباسات اور اسالیب قرآن کے تتبع نے شاعری کے علاوہ انشا پردازی اور نثر نویسی کو بھی ایک نیا رنج دیا اور ایک نئی رونق بخشی۔ قرآن کریم نے جو ذہنی اور سیاسی انقلاب برپا کیا اس کی بدولت زبان کے اغراض و مقاصد بھی وسیع ہو گئے۔ اب محض چند بدویانہ مضامین کی بجائے عقائد دینیہ، احکام شرعیہ اور امور سیاسیہ و اجتماعیہ سب عربی زبان میں ادا ہونے لگے۔

بنو امیہ کے دور میں دفتری زبان بن جانے کے بعد سے عربی کو مسلمانوں اور بلاد اسلامیہ

کی سرکاری اور علمی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ سرکار دربار میں کوئی اعلیٰ عہدہ پانے کے لیے ـــــ یا علمی دنیا میں نام پیدا کرنے اور کوئی ٹھوس علمی کام کرنے کے لیے اب عربی زبان کی مہارت لازمی ہو گئی ـــــ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی بنیاد قرآن و سنت پر تھی بچے کی تعلیم کا آغاز قرأت اور حفظِ قرآن سے ہوتا تھا۔ اعلیٰ سطح پر عربی کی اس اجتماعی، سیاسی اور علمی اہمیت نے عربی زبان میں مہارت کو وقت کی ضرورت بنا دیا تھا ـــــ تفاسیرِ قرآن میں ادبی اور لغوی رجحان اسی لیے پیدا ہوا کہ اس کے ذریعے ہی ایک مسلمان دینی اور عربی مرد و لحاظ سے اہلِ علم کی صف میں شامل ہونے کے قابل ہو سکتا تھا ـــــ آہستہ آہستہ قرآنی آیات کا تتبع اور ان سے استشہاد صرف فقہی مسائل اور مواعظ یا کلامی مباحث تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور مجالس میں بھی قرآنی آیات کے اقتباسات یا اسالیبِ قرآن پر مبنی کلام اور عبارت کے استعمال کو اس بات کا معیار سمجھا جانے لگا کہ کسی آدمی میں آیات کے استحضار اور ان کے برمحل اطلاق کی کس قدر استعداد موجود ہے۔ مطالب اور معانی کے لحاظ سے قرآنی آیات کے مناسب اور موزوں اقتباسات ـــــ یا مختلف مواقع پر قرآنی اسالیب و مضامین کے استعمال سے نہ صرف تحریر و تقریر میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ قرآن کریم کے اس قسم کے ادبی استعمال سے سامع یا قاری کا ذہن بھی اسلامی سانچے میں ڈھلتا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جو اپنی عبارت اور الفاظ کے اختصار اور مضمون کی جامعیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہو سکتی ہیں اور تحریر و تقریر میں ان کا برمحل استعمال قرآنی ادب و ثقافت کا ایک دلچسپ پہلو ہے ـــــ پھر جب مسلمانوں میں تقویٰ کی کمی کے ساتھ مختلف اجتماعی خرابیاں نمودار ہونے لگیں تو تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں قرآنی آیات کے غلط اور بے موقع اقتباس اور بعض دفعہ قرآنی مضامین کے سوءِ فہم پر مبنی غلط شاعرانہ تخیلات بھی سوسائٹی میں نمودار ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ علومِ قرآن اور مباحثِ قرآنی کے ضمن میں اس مسئلہ کو بھی علمائے حق نے موضوعِ بحث بنایا کہ قرآنی آیات اور مضامین کا اس طرح سے ادبی استعمال جائز بھی ہے یا نہیں؟

زرکشی نے البرہان کی پہلی جلد کے آخر پر ایک "نوع" (۳۰ ویں) کا عنوان یہی لکھا ہے۔ "ھل یجوز فی التصانیف والرسائل والخطب استعمال بعض آیات القرآن وھل یقتبس منه فی شعر ویغیر نظمه بتقدیم وتاخیر۔ (کیا تصانیف یا خط و کتابت یا تقاریر میں بعض

قرآنی آیات کا استعمال جائز ہے؟ اور کیا اس سے شعر و شاعری میں کوئی اقتباس بعینہٖ یا الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ لینا درست ہے؟) ـــــ اسی طرح سیوطی نے الاتقان کی فصل چہارم کا عنوان " فی الاقتباس وما جری مجراہ " (اقتباس اور اسی قسم کے دوسرے امور کے بارے میں) رکھا ہے۔ اور اسی فصل میں خود اقتباس کی تعریف یہی کی ہے کہ " قولہ تعالیٰ یا قال اللہ تعالیٰ " کہے بغیر قرآن کریم کی کسی آیت یا اس کے جزء کو نظم و نثر میں برمحل استعمال کیا جائے" سیوطی نے ہی اس قسم کے اقتباس کے ـــــ شرعی حکم کے اعتبار سے ـــــ تین درجے یا قسمیں بیان کی ہیں: مقبول، مباح اور مردود۔ ـــــ اقتباس مردود کے ضمن میں مثالیں دیتے ہوئے سیوطی نے ایک تو کسی ایسے زن بر اعصاب سوار یا وہ گو شاعر کے دو ایسے شعر بھی لکھے ہیں کہ جن کا لکھنا پڑھنا بھی نقل کفر ہے ـــــ اور ایک مثال کسی حکمران کی لکھی ہے کہ جس نے غضبناک ہو کر اپنے کسی عامل یا مخالف کو دھمکی دیتے ہوئے لکھا تھا " إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (الغاشیہ: ۲۵-۲۶) (بے شک ان لوگوں کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے) قرآن کریم کی کسی ایسی آیات کو جس میں اللہ جل شانہٗ نے ضمیر متکلم میں کلام فرمایا ہو اسے اپنی طرف بطور نقل نسبت دینا گناہ ہی نہیں ادبی کور ذوقی کی دلیل بھی ہے۔ اسی قسم کے غلط اقتباس کی ایک مثال زرکشی نے اس شعر کی دی ہے ؎

ولو أن مابی من جوىً و صبابۃٍ　　　علی جمل لم یبق فی النار خالد

(اگر اونٹ اس بلائے عشق سے دوچار ہو جائے جس سے مجھے واسطہ پڑا ہے تو کوئی بھی ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے) (خیال رہے شاعر نے شعر کے اس تخیل میں آیہ کریمہ " وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف: ۴۰) کے مضمون سے حاصل کیا ہے (کہ وہ ـ مکذبین و مستکبرین ـــــ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ داخل نہ ہو جائے) یہ شاعرانہ تخیل نرا ملحدانہ نہ سہی تاہم قرآن کے سوء فہم پر مبنی ہے کہ شاعر نے وجہ خلود تکذیب و استکبار کی بجائے اونٹ کا عدم نحول (لاغر نہ ہونا) سمجھ لیا ہے) ـــــ اقتباس کے اس قسم کے ممکن غلط استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے ہی غالباً مالکیہ سے (بقول سیوطی) قرآنی اقتباسات کے کلام انسانی میں استعمال کی مطلق تحریم منقول ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک انتہا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے۔ اقتباس حسن کی مثالیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے کلام میں ثابت ہیں۔ تاہم ہم نے اپنی بات کے شروع ہی میں اس ملحدانہ یا فاسقانہ

سخن فہمی اور سخن آفرینی کی مثالوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ قرآنی آیات کے برمحل اور برجستہ صحیح ادبی استعمال کے لیے تین شرائط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے (۱) قرآنی آیات کا استحضار۔ (۲) عربی زبان کی مہارت ——— اور اسی لیے زرکشی نے لکھا ہے کہ "جوز ذلك بعضهم للمتمكن من العربية" (یعنی بعض نے اسے صرف ماہر عربی کے لیے جائز قرار دیا ہے) (۳) اور سب سے اہم ——— صحیح دینی ذہن ———

ان شرائط کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس یا اسالیب قرآن کا صوری یا معنوی تتبع نہ صرف جائز اور مقبول ہے بلکہ بعض دفعہ یہ تزیین کلام کے لحاظ سے حسن اور تاثیر معنی کے لحاظ سے قوت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کلام صحابہؓ سے ثابت اقتباسات قرآنیہ کی مثالوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ——— آنحضرتؐ کا "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ" پڑھنا ——— نماز سے پہلے ——— ثابت ہے جب کہ اصل آیت قرآنی "إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ" (الانعام: ۷۹) ہے۔

(۲) ——— آپؐ کی دعا بالفاظ "اللهم آتنا في الدنيا حسنة" بھی ثابت ہے جب کہ آیت قرآنی "رَبَّنَا آتِنَا" (البقرہ: ۲۰۱) سے شروع ہوتی ہے۔

(۳) ——— آپؐ نے ہرقل ——— قیصر روم ——— والے مکتوب میں "سَلَامٌ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ" لکھوایا جب کہ اصل آیت میں "وَالسَّلَامُ" (طٰہٰ: ۴۷) ہے ——— اور اسی مکتوب میں آپؐ نے آیہ کریمہ "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" بھی (آل عمران ۶۴ سے) (بظاہر) بطور قصد کلام (نہ کہ بقصد تلاوت) استعمال کی تھی۔

(۴) ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا یوں بھی ثابت ہے "اللهم فالق الاصباح جاعل الليل سكنًا والشمس والقمر حسبانًا ——— اقض عني الدين وأغنني من الفقر ——— اس دعا کا ابتدائی حصہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۹۶ سے بتغیر الفاظ ماخوذ ہے

(۵) ——— حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بسیاق کلام (بغیر قصد تلاوت) "وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ" (الشعراء: ۲۲۷) (اور ان ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے)

(۶) ——— حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غالباً بیعت ابی بکر کے وقت کہا تھا "إِنِّي مُبَايِعٌ صَاحِبَكُمْ

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ـــــ اس کلام کا آخری حصہ (سورۃ الانفال: ۴۲) سے (بظاہر) بغیر قصد تلاوت ہی استعمال کیا گیا ہے۔

(۷) ـــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ (بطور کلام) "قد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ" ـــ کہا تھا جو سورۃ الاحزاب: ۲۱ سے تبغیر الفاظ ماخوذ ہے۔

اس قسم کی مثالوں سے ہی اہل علم نے قرآنی آیات کے اقتباس میں قصد کی شرط رکھی ہے۔ یعنی آدمی اسے تلاوت نہ سمجھے (قصد تلاوت کے لیے قولہ تعالیٰ ـــ یا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ـــ یا جیسے قرآن کریم میں ہے ـــ وغیرہ کہنا ضروری ہوگا) اس لیے امام نووی نے آداب حملۃ القرآن میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر جنبی یا حائض بغیر قصد تلاوت کسی سے کہے "خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (مریم: ۱۲) تو یہ درست ہوگا جب مراد کوئی اور کتاب لے رہا ہو ـــ یا ایسا ہی آدمی کسی سواری پر سوار ہوتے وقت آیہ کریمہ "سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (الزخرف: ۱۳) کو بغیر قصد تلاوت محض ادائے مضمون (کہ پاک ہے وہ جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا ورنہ ہم تو ایسے نہ تھے کہ اسے قابو میں کر لیتے) کے لیے پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔ خیال رہے ان دو عذر شرعی کے بغیر آدمی ایسے موقع پر بھی آیت بقصد تلاوت پڑھ سکتا ہے۔

اس موضوع پر اپنے مختصر سے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تحریر اور تقریر میں قرآنی آیات کے اقتباس ـــ اور قرآنی اسالیب کے صوری یا معنوی تتبع کی جائز اور مستحسن صورتوں کو پانچ عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱ ـــ ضرب المثل یا "حکم و امثال" کے طور پر برجستہ و برمحل اطلاق کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس۔

۲ ـــ جامع اسلامی تعلیمات پر مشتمل مختصر آیات یا ان کے حصے۔

۳ ـــ عام روز مرہ کی گفتگو میں قرآنی آیات کا استعمال (بغیر قصد تلاوت)۔

۴ ـــ نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی میں قرآنی آیات کا استعمال یا نظم و نثر میں اس کا اقتباس

۵ ـــ اشعار اور عربی عبارات میں آیات کا اقتباس یا اسلوب قرآنی کا صوری و معنوی تتبع۔

اب ہم ہر ایک موضوع سے متعلق صرف چند آیات اور کچھ واقعات اور عبارات بطور مثال اور برائے توضیح پیش کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

پندرھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے پندرہ کروڑ اور پوری دنیا کے ایک سو پندرہ کروڑ (۱۱۵) مسلمانوں کے لئے اعلانِ مسرت

چودہ سو برس (۱۴۰۰) میں دورِ قدیم سے موجودہ دور تک خطاطی کے ۱۱۴ نمونوں کو القرآن الحکیم (الفی) میں جمع کئے جانے کا تاریخی اہتمام

الحمدُللہ کہ قرآن مجید کی سات منزلوں کو سات برسوں میں طے کر لیا گیا القرآن اکیڈمی بمبئی و دہلی کے القرآن الحکیم (الفی) کی تکمیل

القرآن الحکیم (الفی)

القرآن اکاڈمی
کے زیرِ اہتمام ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء
ایک ایسے قرآن مجید کی کتابت
شروع ہوئی تھی، جس کا ہر صفحہ
۲۳ سطری ہے اور ہر سطر
الف سے شروع کیا گیا ہے
اس قرآنِ حکیم کی یہ بھی تاریخی
خصوصیت ہے کہ نزولِ قرآن
کے وقت کی کتابت کے نمونے
سے موجودہ دور کی خطاطی کے
شاہکار، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
کو ۱۱۴- طریقے سے کتابت
کرکے قرآن کی تاریخی دستاویز بنایا

القرآن الحکیم (الفی) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہرِ نبوت کے ساتھ تاریخی خطوط، اور ہرن کی جھلّی پر کتابت شدہ قرآن مجید کے صفحات کا عکسِ جمیل پیش کیا گیا ہے۔

القرآن الحکیم (الفی) قرآن کی (۷) سات منزلوں کو ۱۴ سو برس یعنی دورِ خلافت راشدہ[۱]، دورِ بنو امیہ[۲]، دورِ بنو عباسیہ[۳]، دورِ بنو فاطمیہ[۴]، دورِ عثمانیہ (ترکیہ)[۵]، دورِ سلجوقیہ[۶]، خلجیہ، تغلقیہ، غزنویہ اور دورِ مغلیہ[۷] کے سلاطین کی کتابتِ قرآنِ مجید کے نمونوں کا تاریخی مرقع ہے۔

"پندرھویں صدی ہجری" کے مبارک موقع پر پیش کیا جانے والا "القرآن الحکیم (الفی)" جلی قلم کتابت کے باوجود ۱۹۶ صفحات میں مکمل ہے۔ اس کو سات رنگ کے کئی حاشیوں سے مزین کرکے "آرٹ پیپر" پر "سنگاپور" میں چھپوایا جا رہا ہے۔ "القرآن اکاڈمی" بمبئی و دہلی نے دنیا کے بیشتر ممالک میں القرآن الحکیم (الفی) کے جشنِ افتتاح کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ ادارہ کی ایسی نورانی پیش کش کی زیارت و تلاوت کا انتظار فرمائیے۔

القرآن اکاڈمی بمبئی و دہلی

نگرانِ اعلیٰ
الحاج اکبر خان منشی گل

کاتبِ قرآن
مولوی محمد یوسف قاسمی

تزئین کار
سید احمد رامپوری ثم الدہلوی

پرنٹر و پبلشر
محمود خان اکبر خان

انتظامی امور و طباعت کے نگراں
نورالدین آزاد

ادارۂ الرسالہ دہلی، اسلامی مرکز دہلی و حیدرآباد کے سربراہ مولانا وحید الدین خان صاحب کا تاثر اسی شمارے میں دیکھئے!

مزید تفصیلات جاننے کے لئے رابطہ قائم کیجئے! — مہتمم القرآن اکاڈمی
بمبئی ۱۰۴- کامبیکر اسٹریٹ، تیسرا منزلہ بمبئی ۳
دہلی ۲۰۳۴- قاسم جان اسٹریٹ، ممتاز بلڈنگ دہلی ۶

قرآن کی تاریخ

"ماہنامہ "الرسالہ" دہلی "اسلامی مرکز" (دہلی وحید آباد) کے سربراہ حضرت مولانا وحید الدین خان صاحب نصف صدی سے کچھ کم عرصہ، تحریر و تقریر کے ذریعے مسلمانانِ عالم کو عام فہم طریقہ پر اسلام کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ حقوق اللہ، حقوق الرسول اور حقوق العباد کے موضوعات پر مضامین اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ عام ذہن اور علمِ جدید کو پڑھے لوگوں کو "اسلام" اور اس کے بنیادی احکامات پر عمل کرنا بہت آسان نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان، دیگر ممالکِ اسلامیہ اور مغربی ممالک میں، آپ کی تحریر و تقریر کے شائقین و عاملین کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں دو جگہ اسلامی مرکز کے قیام نے نشر و اشاعت کے کام میں تیزی کر دی ہے۔ اسلامی مرکز میں بیشتر اجتماعات، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دلچسپی کے ساتھ شرکت اور بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یقین کیا جا سکتا ہے کہ "اسلامی مرکز" کی افادیت عام ہو جائے گی۔

موصوف نے القرآن الحکیم (الفی) کے تکمیلی مراحل ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنا تاثر تحریر فرمایا ہے جو الرسالہ دہلی میں شائع ہوا ہے اور قارئین "دشنہ" کی خدمت میں بھی پیش ہے!

القرآن الحکیم (الفی)

"پندرھویں صدی ہجری کی آمد پر ساری دنیا میں مختلف اسلامی تقریبات منائی گئی ہیں۔ القرآن اکاڈمی (بمبئی، دہلی) نے اس سلسلے میں طویل کوششوں کے بعد ایک اہم تاریخی پیش کش کی ہے۔ یہ قرآن کا ایک منفرد نسخہ ہے۔ جس کا نام "القرآن الحکیم الفی" ہے۔

اس قرآن کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کا عام صفحہ ۲۳ سطری ہے اور ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ ہر پارہ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور پورا قرآن ۱۹۶ صفحات میں مکمل ہو گیا ہے۔ اس میں نزولِ قرآن سے لے کر اب تک خطاطی کے مختلف نمونوں کو ہر سورہ کے شروع ہی میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ۱۱۳، الگ الگ نمونوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن کی سات منزلوں میں سات دوروں کا طرزِ کتابت دکھایا گیا ہے۔

القرآن الحکیم (الفی) کی تیسوں پاروں کی کتابت سات سال میں مکمل ہوئی ہے اور اب تصحیح کے مراحل میں ہے جس کے لئے عالمی مذہبی تعلیمی اداروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ ان سے اسنادِ صحت کے حصول کے بعد، سات رنگوں کے نو مختلف حاشیوں سے مزین کر کے آرٹ پیپر پر سنگاپور میں چھپوایا جا رہا ہے۔ القرآن الحکیم (الفی) کے اطراف کے اندرونی استر کے بعد کے صفحات پر مکتوباتِ نبوی کی تصویر شامل ہے۔ نیز خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ہرن کی جھلی پر لکھے ہوئے قرآن کے صفحات کو عین اسی انداز سے منعکس کیا گیا ہے۔ اس طرح القرآن الحکیم (الفی) کو پڑھنے والا قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیتا ہے کہ قرآن، دورِ نبوی، خلافتِ راشدہ، دورِ بنوامیہ، دورِ عباسیہ، دورِ فاطمیہ، دورِ عثمانیہ، دورِ سلجوقیہ، خلجیہ، تغلقیہ، غزنویہ اور دورِ مغلیہ وغیرہ میں کس کس رسم الخط میں لکھا جاتا رہا ہے۔

تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ یہ ہے کہ قرآن تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کے باوجود اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ القرآن الحکیم (الفی) گویا اس حفاظتِ قرآن کی ایک دستاویز ہے۔ "القرآن الحکیم الفی" قرآن بھی ہے اور قرآن کی تاریخ بھی۔ وہ اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ قرآن کا ایک دلآویز نسخہ ہے اور اسی کے ساتھ قرآن کی تاریخ حفاظت کا ایک خوبصورت مرقع بھی۔

درسِ حدیث

مراقبہ

ریاض الحق

۱۔ عن ابی ذر جندب بن جنادۃ وأبی عبدالرحمن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال : اتق اللہ حیثما کنت وأتبع السّیئَۃ الحسنۃ تمحہا وخالق الناس بخُلُقٍ حسنٍ (رواہ الترمذی)

حضرت ابوذرؓ جندب بن جنادۃ اور ابی عبدالرحمٰن معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : اللہ سے ڈر جہاں کہیں بھی تو ہے اور برائی کے بعد نیکی کر تو وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آ۔

۲۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم قال: ان اللہَ تعالیٰ یغار، وغیرۃ اللہ تعالیٰ ان یأتِیَ المرءُ ما حرّم اللہ علیہ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ غیرت رکھتا ہے اور اللہ کی غیرت یہ ہے کہ آدمی اس چیز کا مرتکب ہو جس کو اللہ نے اس پر حرام کیا۔ (غیرۃ سے یہاں مراد ہے الانفۃُ یعنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرنا اور نفرت سے اپنے رُخ کو پھیر لینا۔

ان احادیث کو امام محی الدین ابی زکریا یحیی بن شرف النووی باب المراقبہ میں لائے ہیں۔

مراقبہ کا لفظ مصدر ہے باب رَاقَبَ یُرَاقِبُ سے جس کا لغوی مفہوم ہے نگرانی کرنا۔ دیکھ بھال کرنا خیال رکھنا اور ڈرنا۔ جیسے رَاقَبَ اللہ خدا سے ڈرا اور راقبَ العَمَل اس نے عمل کی نگہبانی کی نگہداشت کی۔

مراقبہ کے بیان میں درج ذیل آیات یاد رہیں:

قال اللہ تعالیٰ فی سورۃ الشعراء، آیۃ: ۲۱۹ وَالَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ

وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ، وَقَالَ تعالیٰ فی سورۃ الحدید آیۃ ۴ : وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ، وَقَالَ تعالیٰ فی سورۃ آل عمران آیۃ ۵ : إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ، وَقَالَ تعالیٰ فی سورۃ الفجر آیۃ ۱۴ : إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ، وَقَالَ تعالیٰ فی سورۃ الغافر آیۃ ۱۹ : يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ :

آیات کا ترجمہ بالترتیب یہ ہے :

اللہ تعالیٰ نے فرمایا " جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اٹھتا ہے اور تیرا پھرنا نمازیوں میں "۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے " وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو "۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے " اللہ اس پر چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور آسمان میں " ۔ اور فرمایا " تیرا رب لگا ہے گھات میں " اور فرمایا " وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ اور جو چھپا ہے سینوں میں "۔

مندرجہ بالا آیات اور احادیث نے مل کر اس مضمون کی بہت وضاحت کر دی ہے ۔ تاہم سادہ الفاظ میں یہ دل میں اللہ کا حضور ہے ۔ انسان کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہے لیکن تمام انسانوں میں اس کی کیفیات مختلف رہتی ہیں ۔ اس کی بہترین کیفیت یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت ایسے کرے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے ۔ اگرچہ اللہ انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے اور ہر وقت ہے لیکن انسان پر ذہول طاری ہو جاتا ہے اور وہ اللہ سے اپنا رابطہ کمزور کر لیتا ہے ۔ یہ طرز عمل اس کو خسران اور نقصان کی طرف لے جاتا ہے ۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ مراقبہ کرے ۔ اب سوال یہ ہے کہ مراقبہ کس بات کا ! اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت انسان کے ساتھ ہے ۔ اس کی نگرانی کر رہا ہے ۔ اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اس کی کوئی بات چاہے وہ دل میں آنے والا خیال ہو اللہ سے پوشیدہ نہیں ۔

اللہ کی یہ یاد یہ ذکر دو طرفہ انسان کے اعمال و کردار پر اثر انداز ہوگا ۔ جب اسے یقین ہو جائے گا کہ اللہ ہر وقت اس کو اور اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے تو وہ ہر وقت اللہ سے ڈرے گا اس کی نافرمانی ، اس کے غضب اور ناراضگی سے بچے گا ۔ اللہ کی قائم کی ہوئی حدود احکامات اور اس کے محرمات کو نہیں توڑے گا ۔ اگر انسانی کمزوری کی وجہ سے کوئی غلطی ہو بھی جائے تو وہ فوراً توبہ کرے گا اور نیکی کرے گا تاکہ اس کی برائی کا اثر زائل ہو جائے ۔ انسان کے لئے اس راہ میں اسوہ ہر حال میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے جو " إِنَّكَ لَعَلَىٰ

خُلُقٍ عَظِیم" کے مرتبے پر فائز ہیں۔ بنی نوع انسان کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ جس کی آخری حد یہ ہے کہ اپنے ہم جنس کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرے۔ مذکورہ بالا حدیثیں انہیں تعلیمات کی حامل ہیں۔

دوسرا پہلو استحضار اللہ فی القلب کا یہ ہے کہ یہ انسان کے لئے ایک بہت بڑی تسلی دلجوئی اطمینان قلب اثبات فی الدین اور دلجمعی کا واحد ذریعہ ہوگا۔ اگر کوئی انسان نیک عمل کرنا چاہے تو اس کے لئے سب سے بڑے محرکات یہ ہوتے ہیں کہ کوئی اس کے اس عمل کو دیکھ رہا ہو اس کی دلجوئی کرے اور اس کو جزا Reward دے۔ جب انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ ہر وقت اس کے ساتھ ہے اور اسے دیکھ رہا ہے تو اس کو دنیا کی کسی چیز کسی ملامت کسی مشکل کا خوف نہیں ہوگا۔ وہ "لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ" کے مرتبے پر فائز ہوگا۔ اس کے علاوہ راہ حق کی مشکلات مصائب اور الجھنوں میں ہر وقت اس بات کا اطمینان حاصل ہوگا کہ اس کے یہ اعمال رائیگاں نہیں جائیں گے بلکہ ایک علیم وخبیر ہستی اس کو دیکھ رہی ہے۔ وہ اللہ قدردان اور رحیم ہے وہ اس کے تمام اچھے اعمال کا بہترین انعام دے گا۔ یہ احساس اس کو کسی کمزوری اور پریشانی سے خوفزدہ نہیں کرسکتا۔ اللہ ہمیں اپنا دھیان نصیب فرمائے۔ آمین!

❀❀❀

(بقیہ حاشیہ حضرت عمرؓ اور تصوف)

شیخ الشیوخ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی جہاجرمدنی دامت برکاتہم کو یہ تصدیق فرماتے سنا کہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ اس صدی کے مجدد تھے۔

خریدار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ادارہ کو غیر ضروری زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ ہماری گذارش کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ (ادارہ)

کتابیات

سیرۃ الخلیل (باب ثانی)

خلقی رشد و ہدایت

مولانا الطاف الرحمٰن نبوی

کسی آبادی میں نبی کی بعثت ہی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہاں کے لوگوں کا اخلاقی بگاڑ انتہا کو پہنچ گیا ہے، قوم انسانی اقدار کی پامالی اور فتنہ و فساد کی گرم بازاری پر تلی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اسکے حدود کو بے تحاشا توڑا جا رہا ہے الغرض خالقِ حقیقی کو فراموش کیا گیا اور مخلوق پرستی ..... جو عموماً گوناگوں پرکشش سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے ..... کا دور دورہ ہے۔

چار سو پھیلی ہوئی اور کائنات کے ذرّے ذرّے کی پیشانی پر لکھی ہوئی آیاتِ بیّنات اگرچہ زبانِ حال سے خدائے وحدہ لاشریک کی بندگی کی طرف بلا رہی ہوتی ہیں لیکن ابلیس کی تلبیس اور نفسِ امّارہ کی سرکشیاں فکر و تدبّر کو ان کی جانب متوجّہ نہیں ہونے دیتیں ——!!

اندریں حالات جبکہ پورے ماحول میں ہوٰی و ہوس کی حکمرانی اور اسی کا سکّہ چل رہا ہو، دور و قریب کے سارے تعلقات اسی کی بنیاد پر استوار ہوں اور گرد و پیش کی ہر چیز بڑے زور و شور سے اسی کی طرف ترغیب دے رہی ہو کسی نئے آنے والے کا زمانے کی عام ڈگر کو چھوڑ کر کوئی اور روش اختیار کرنا ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہوتا ہے۔ گویا خدا بیزار معاشرہ بعینہٖ نمک کی وہ کان ہے جس میں کوئی چیز بھی گر کر نمک ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

ایسی صورت میں ہدایت کی شمع جلانے اور خدا پرستی کی صدا لگانے کے لئے قدرت کی طرف سے غیر معمولی اقدامات کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی انسان کو نبی و رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے تاکہ فطرت کی کھلی شاہراہ سے وقت کی تمام رکاوٹوں کو ایک ایک کر کے ہٹا دے

اور سوچ و فکر کے تاریک گوشوں کو بھی منور کر دے۔

یہ انسان .... نبی و رسول .... اگرچہ اپنی ذات و ماہیت میں انسان ہی ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے اجزائے عنصری پر مشتمل، لیکن اپنے صفات و خصائل کی وجہ سے مجد و شرف کی اس چوٹی پر متمکن ہوتا ہے جو وجوب سے نیچے امکان کی سب سے بلند و بالا چوٹی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوعی وحدت و اشتراک کے باوجود دوسرے تمام ابنائے نوع سے نوعی طور پر مختلف اور متفاوت دکھائی دیتا ہے گویا سیرت کی تابانی صورت کی مادی ظلمت و کثافت کے آرپار ہو کر پورے بدن کو بقعۂ نور بنا دیتی ہے[۱] یہی مطلب ہے مجدد صاحب کے اس ارشاد کا۔

"اگرچہ عوام الناس انبیاء علیہم الصلوٰت و التسلیمات کے ساتھ نفس انسانیت میں شریک ہیں لیکن دوسرے کمالات نے انبیاء علیہم السلام کو درجاتِ علیا تک پہنچا دیا ہے۔ اور ان کے لئے دوسری حقیقت ثابت کر دی ہے۔ گویا یہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰت و التسلیمات حقیقت مشترکہ انسانی سے بلند و برتر ہیں۔ بلکہ انسان ہی صرف یہی ہیں[۲]"

(دفتر حصہ مکتوب)

---

[۱] اس سلسلے میں تقریب الی الفہم کے لئے ہزار دولٹ پاور کے اس بلب کی مثال دی جاسکتی ہے جس کی انتہائی تیز روشنی اس کے تمام دوسرے مادی اجزاء پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ پورا قمقمہ نور ہی نور دکھائی دیتا ہے لیکن نور کے اس غلبے کے باوجود اس کی مادیت فنا تو نہیں ہوتی بلکہ عین اس حالت میں بھی اس کی بعض خصوصیات مثلاً وزن داری اور تحیز وغیرہ قائم رہتی ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰت و التسلیمات کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب ضرور ہوتی ہے۔ تاہم وہ بالکل فنا نہیں ہوتی۔ چنانچہ تمام انسانی مادی ضروریات کا پیش آجانا اس کی واضح دلیل ہے۔

[۲] مکتوبات کا ایک معاصر مترجم اس مکتوب پر حاشیہ آرائی کرتا ہوا لکھتا ہے،

"حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے "بشر مثلکم" کی رٹ لگانے والے حضرات غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے حضرت امام ربانی کے دفتر اوّل مکتوب ۲۶۶ کی مندرجہ ذیل عبارت توڑ کر پڑھتے اور پیش کرتے ہیں کہ: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نبی نہ صرف یہ کہ ضلالت و گمراہی کے ان گھپ اندھیروں میں اپنی راست روی کا ذمہ دار ہوتا ہے بلکہ سالارِ کارواں بن کر پورے قافلے کی رہنمائی بھی اسی کا منصبی فریضہ ہوتا ہے۔ اس دوہری ذمہ داری سے کامیابی کے ساتھ نمٹنے کے لئے اس کی ذات میں دو باتیں

(تسلسل) "نمی بینی کہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات باعامہ در نفس انسانیت برابر اند و در حقیقت و ذات متحد"

لیکن افسوس کہ دفتر دوم کے اس مکتوب کی اس عبارت پر غور نہیں کرتے۔ اس عبارت میں حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "خصوصی کمالات کی بنا پر انبیاء علیہم الصلوٰت کی حقیقت عوام کی حقیقت سے الگ ہے۔ یہ تو عام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے متعلق فرمایا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تو امام ربانی فرماتے ہیں کہ آپ کی حقیقت نور ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں اور آپ اس امکان سے پیدا نہیں ہوئے جس سے باقی تمام مخلوقات بنی ہیں"۔ مکتوب شریف کے ہر سہ دفتر میں ایک ہی لفظ ایسا بتایا جائے جو صراحۃً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہو کہ آپ بھی نفسِ انسانیت میں عامۃ الناس کے برابر اور متحد ہیں۔ اس کے برعکس ہم مکتوبات شریف میں متعدد ایسی عبارات دکھاتے ہیں جن میں صراحۃً مذکور ہے کہ آپ کی حقیقت عام انسانوں کی حقیقت سے بالکل الگ ہے۔"

اس کے بعد فاضل مترجم نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے بخاری شریف کی ایک حدیث اور امام فخر الدین رازیؒ اور علامہ قسطلانیؒ کی بعض ان عبارتوں کو نقل کیا ہے جن میں اس کی تائید سے زیادہ تردید کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اُلٹی گنگا کی اس روش کا کہ دعویٰ کو دلائل کا نہیں بلکہ دلائل کو دعوے کا تابع بنایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں کسی بھی کھینچ تان اور تراش و خراش سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ اس بنیادی موضوع پر ان ضمنی حواشی میں کچھ کہہ لکھنے کی نہ کوئی ضرورت ہے..... ..... کہ قرآن و حدیث کی متعدد صریح آیات اور اساطین علم و عمل کی مزید تشریحات و توضیحات نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے..... اور نہ ہی کوئی گنجائش۔ تاہم اتنی موٹی بات تو ہماری طالب علمی نے بھی بڑی سرعت سے محسوس کی کہ "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" جیسی قطعی الدلالت نص قرآنی کے مقابلے میں بخاری شریف کی لست کاحدٍ منکم یا انی لست مثلکم وکھیئتکم

ناگزیر حد تک ضروری ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ عصری میلانات کے غیر شعوری اثرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن کا ہر گوشہ نورِ عرفان سے منور اور غیر متزلزل یقین سے مملو ہو تاکہ تردد اور بے یقینی کی کوئی ایسی خلاء موجود ہی نہ ہو جس میں کسی قسم کی بداعتقادی راہ پا سکے، دوسری یہ کہ صبر و تحمل اور مضبوطی و استحکام کی ایسی قوتوں سے لیس ہو جن کی بدولت روح و قالب کی کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی عزیمت کی سخت جانیوں سے منہ موڑ کر رخصت کی تن آسانیوں کو اختیار کرنے والا نہ ہو۔

بلاشبہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام انہی صفات سے موصوف تھے۔ خلقی رشد و ہدایت

نفاسیر، جیسی منصب حدیث اور خاص کر ایسی حالت میں نہایت فراغت کے ساتھ بڑی آسانی سے ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے، پیش کرنے والے یا تو علم و ہل و حجت کے مبادیات سے بھی قابل رحم حد تک محروم اور کورے ہیں اور یا پھر گروہی تعصب نے ان کو خواہ مخواہ کی کٹ حجتی پر آمادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھے۔

یہاں تو ہم نے صاحب موصوف کے فقط اس چیلنج کو کہ "مکتوب شریف کے ہر سہ دفتر میں ایک ہی لفظ ایسا بتایا جائے جو صراحتاً حضور علیہ السلام کے متعلق ہو کہ آپ بھی نفسِ انسانیت میں عامۃ الناس کے ساتھ برابر و متحد ہیں" قبول کر کے مجدد صاحبؒ کی وہ تصریح بتائی ہے جس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

قارئین کرام مکتوبات کی مندرجہ ذیل عبارات کو پڑھئے اور پھر چیلنج کرنے والوں کی صدق و امانت کی داد دیجئے۔

"تمام موجودات سے افضل ہونے کی علت بھی انسان کی یہی وصف جامعیت ہے اسی بنا پر اس کا آئینہ سب سے زیادہ مکمل ہے اور جو کائنات کے شیشوں میں جزواً فرداً ظاہر ہے وہ سب کچھ انسان کے صرف اکیلے آئینے میں ظاہر ہے تو اس لحاظ سے بہترین خلائق بھی انسان ہی ہے اور گذشتہ اعتبار سے بدترین مخلوق بھی انسان ہی ہے اس لئے کہ نوعِ انسان سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہیں اور ابوجہل علیہ اللعنۃ بھی۔"

اے بھائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باوجود اس بلند شان و مرتبہ کے بشر تھے اور حدوث و امکان کے داغ سے متصف تھے

مکتوب ۲۶۱ دفتر اول ص۲۲۱ طبع امرتسر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تا یہ عالم کہ ہوش سنبھالتے ہی عہد نمرودی کے ایک ایک معبود کو مسترد کرتا گیا تا آنکہ وَیَکُونَ الدِّینُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (سورۃ انفال آیت ۳۹) کا علمی سکہ بٹھا دیا اور عزم و استقلال کی یہ حالت کہ حیات مستعار کے ہر لمحے کوئی نہ کوئی سخت ترین ابتلا ہوتی مگر ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ قرآن حکیم نے انہی حقائق سے یوں پردہ اٹھایا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ	اور بالیقین ہم (اس سے بھی) پہلے ابراہیمؑ کو خوش فہمی عطا کر چکے تھے۔
(سورۃ انبیاء آیت ۵۱)	
وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ہ	اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند امور سے آزمایا اور انہوں نے وہ انجام دے دیئے۔
(سورۃ بقرہ آیت ۱۲۴)	

(جاری ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴)

مذکورہ بالا اقتباسات اسی ترجمہ سے ماخوذ ہے جو موصوف کی جانب منسوب ہیں یہ کہنے کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں کہ ممکن ہے یہ تصریحات ان کی نظر سے چوک گئی ہوں حالانکہ اللہ اشتکی بس انہیں کے الفاظ میں یہ دعا کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ بدعقیدگی سے بچائے اور صدق و خلوص کی توفیق عطا فرمائے۔"

(بقیہ: قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت)

(۳) ادنیٰ انسانی بنیاد اور قوی حیوانی بنیاد
(۴) ادنیٰ انسانی بنیاد اور ضعیف حیوانی بنیاد

معاملت (ترغیب و ترہیب) کی صحیح بنیاد پہ ان کی تقسیم یہ ہے:

(۱) اعلیٰ انسانی بنیاد اور قوی حیوانی بنیاد
(۲) اعلیٰ انسانی بنیاد اور ضعیف حیوانی بنیاد
(۳) ادنیٰ انسانی بنیاد اور قوی حیوانی بنیاد
(۴) ادنیٰ انسانی بنیاد اور ضعیف حیوانی بنیاد[1]

مفہوم کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف تعبیر و تشریح کا فرق ہے۔

(باقی آئندہ)

[1] ماخوذ ہو حدیث کا دینی معیار صفحہ ۱۱۵

قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت

قسط نمبر ۸

مولانا محمد تقی امینی

"احسن تقویم" میں نامیاتی لہروں کے ساتھ نوری کرنوں کی آمیزش اور اس کے نتیجہ میں مختلف خصوصیتوں اور صلاحیتوں کا ظہور قدرت کی صناعی کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس تک رسائی تو درکنار اس پر گفتگو کی بھی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔

نامیاتی لہریں طبعی قوتوں سے پیدا ہوتی ہیں اور قوتیں ان اجزاء کے خواص و اثرات سے وجود میں آتی ہیں جو پیکر انسانی کی بناوٹ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ استعمال ہونے والے وہ اجزاء تھے جو قوت و پختگی کے لحاظ سے حیوانی اجزاء سے بلند و برتر تھے کہ اس کے بغیر اجزاء پر نہ انسان کی صورت گری ہو سکتی اور نہ ان میں نوری کرنوں کے تحمل و برداشت کی طاقت ہو سکتی تھی۔

قرآن حکیم نے انسان کی پیدائش کے بیان میں کئی الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاک کے ذرے نے ایک دم پیکر انسانی کی شکل نہیں اختیار کی بلکہ کچھ خصوصیات پیدا کرنے کے لئے اس کو مختلف مراحل سے گذارا گیا ہے۔ مثلاً:۔

طین ۔ وہ مٹی جو پانی کے ساتھ ملی ہوئی[1]

سُلٰلۃ ۔ ست یا خلاصہ جو زمین سے کھینچ کر نکالا جائے[2]

صلصال من حمأ مسنون[3] کھنکھناتی خشک مٹی جو سڑے ہوئے گارے سے تیار ہوئی ہے

تمدن کی تاسیس میں نفس بادی، نفس انسانی اور نفس حیوانی کی بحث ملتی ہے۔[4]

۱، ۲، ۳ راغب اصفہانی، المفردات　　۴ محمد جلال الدین اخلاق جلالی صفحہ ۲۲ (باقی اگلے صفحہ پر)

جن سے مختلف مراحل کی تائید ہوتی ہے، لیکن اس بحث سے خواص و اثرات کے صرف خصوصیاتی یا نفسیاتی ارتقاء کا ثبوت ملتا ہے کہ خاک کے ذرہ میں ایک دم سے نہیں بلکہ بتدریج انسان کی صورت گری و نوری کرنوں کی تحمّل و برداشت کی خصوصیت و صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور جدید دنیا جس ارتقاء سے بحث کرتی ہے وہ حیاتیاتی ارتقاء کی ہے کہ جس کے لحاظ سے انسان تمام ترحیوان کی ترقی یافتہ شکل قرار پاتا ہے اور اس کی ساخت کے کسی مرحلے میں بھی کسی نورانی توانائی کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اوپر بیان کردہ تفصیلات سے یہ نظریہ غلط ہو جاتا ہے۔

انسان کی طبعی زندگی اس کی قوتوں اور ان سے پیدا شدہ نامیاتی لہروں اسی طرح نورانی توانائی اس کی شعاعوں اور ان سے پیدا شدہ نوری کرنوں اور پھر مختلف گروپ و حصّوں میں ان کی تقسیم اور دونوں میں خاص مناسبت قائم کر کے ایک کی دوسرے کے ساتھ آمیزش اور اس کے نتیجہ میں انسانی خصوصیتوں اور صلاحیتوں کا ظہور و باہمی تفاوت وغیرہ سے انسان کی ساخت کا ایک نیا رخ متعین ہوتا ہے جو یقیناً اس رُخ سے مختلف ہے جو جدید دنیا نے متعین کیا ہے۔ اس نئے رخ کو سامنے رکھ کر نظریہ ارتقاء کی نئے انداز سے توجیہہ و تشریح کی ضرورت ہے۔

سردست صرف دو قوتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا خصوصیتوں اور صلاحیتوں کے پیدا کرنے اور ان کی کمی بیشی میں خاص کردار ہے وہ یہ ہیں:

(۱) خواہش ـــــ ادنیٰ

(۲) شعور

خواہش طبعی زندگی کے تقاضا سے پیدا ہوتی اور شعور نوری کرنوں کے پرتو سے وجود میں آتا ہے۔ شعور کی اپنی مستقل اکائی ہے جس طرح خواہش کی اپنی اکائی ہے۔ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ شعور اور اس سے پیدا شدہ علم و حکمت اور اخلاق وغیرہ کا سرچشمہ [illegible] کے اثرات یا ناآسودہ جنسی خواہشات کو قرار دیا جائے جیسا کہ جدید نظریات میں

[illegible] اطوار و منازل تعلقت آدمی از ابتداء کی کتاب " [illegible] کا تاریخی پس منظر " و " تہذیب کی تشکیل جدید " [illegible]

کسی نوری توانائی تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے لازم آتا ہے ۔ یہ خواہش اوران سے متعلق نامیاتی لہریں ہرانسان میں یکساں نہیں ہوتی ہیں، بلکہ زمین، فضا، آب وہوا اور سختی ونرمی کثافت ولطافت وغیرہ کے اختلاف کی وجہ سے ان میں کافی فرق ہوتا ہے ۔ اسی طرح نورانی کرنوں کا پرتو بھی نامیاتی لہروں پر یکساں نہیں پڑتا ہے بلکہ کرنوں اور لہروں کے درمیان جو مناسبت قائم کردی گئی ہے اسی کے لحاظ سے کرنیں لہروں میں اپنا جلوہ دکھاتی اور انسانی اوصاف وخصائص کا سرچشمہ بنتی ہیں ۔

کرنوں کی تقسیم کو قریب الفہم بنانے کے لئے اس وقت انکے دو بڑے حصے کئے جاتے ہیں ۔

(۱) اعلیٰ ——— اوسط

(۲) ادنیٰ

یہ تقسیم مناسبت کو ملحوظ رکھ کر ہے ورنہ کرنیں اپنی اصل کے اعتبار سے سب اعلیٰ ہیں ۔
اسی طرح لہروں کو سمجھنے کے لئے ان کو دو بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔

(۱) قوی ——— اوسط

(۲) ضعیف

یہ تقسیم بھی مناسبت کو ملحوظ رکھ کر ہے ورنہ لہریں اپنی اصل کے اعتبار سے بے حد مختلف ہیں ۔

کرنوں اور لہروں کے درمیان جذب وکشش کی مناسبت وقوت جانچنے کے لئے دو بڑے پیمانے مقرر کئے جاتے ہیں ۔

(۱) سختی ومضبوطی ——— اوسط

(۲) نرمی ولچک

(۱) کرنیں اور لہریں دونوں اپنی اپنی جگہ سختی ومضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور لہریں اپنے کو دبا کر کرنوں کی طرف مائل نہ نظر آتی ہوں ۔

(۲) کرنیں اور لہریں اپنی اپنی جگہ قائم ہونے کے باوجود ان میں پہلی جیسی سختی ومضبوطی نہ ہو بلکہ کرنیں کچھ نرم گوشہ رکھتی ہوں ۔ اسی طرح لہروں میں بھی کچھ نرمی ولچک موجود ہو۔
پہلی صورت میں کرنوں اور لہروں کے درمیان نزاع وکشمکش جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے اندرونی حالت میں اضطراب وبے چینی پائی جاتی ہے اور دوسری صورت میں

کرنوں اور لہروں کے درمیان ہمواری و صلح جوئی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اندرونی حالت پہلی کے مقابلہ میں اگرچہ پُرسکون رہتی ہے لیکن اضطراب و بے چینی کی کیفیت اس میں بھی موجود رہتی ہے۔ کرنوں اور لہروں کے انفرادی خواص و اثرات یہ ہیں۔

اعلیٰ کرنوں سے اعلیٰ درجہ کے کمالات اور بلند احوال و مقامات حاصل کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور ادنیٰ کرنوں سے معمولی درجہ کے کمالات اور احوال و مقامات کی اہلیت ہوتی ہے۔

قوی لہروں سے شوکت و سطوت اور غلبۂ و اقتدار حاصل کرنے کی اونچے درجہ کی اہلیت ہوتی ہے اور ضعیف لہروں سے یہ اہلیت معمولی درجہ کی ہوتی ہے۔

کرنوں اور لہروں کے باہمی امتزاج کے بعد اہلیت میں تفاوت کے لحاظ سے انسان کی بے شمار قسمیں وجود میں آتی ہیں جن میں سے چند کو ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ دوسری بے شمار کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

کرنوں اور لہروں کے باہمی امتزاج کے بعد خواص و اثرات کو دو بڑی شکلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) سختی و مضبوطی والی شکل

(۲) نرمی و لچک والی شکل

سختی و مضبوطی والی شکل کی چار بڑی قسمیں یہ ہیں:

(۱) اعلیٰ کرنوں اور قوی لہروں سے عزم و ہمت میں پختگی و بلندی پیدا ہوتی ہے۔ اونچے درجہ کے کاموں پر نظر ہوتی اور اونچے درجے کے مناصب و مقامات حاصل کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ اگرچہ بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جتنے بھی ہوتے ہیں ان میں سردار و پیشوا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

(۲) ادنیٰ کرنوں اور قوی لہروں سے عزم و ہمت میں پختگی تو ہوتی ہے لیکن زیادہ بلندی نہیں پائی جاتی ہے جس کی بناء پر اونچے درجے کے کاموں پر نظر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں میں حمیت و غیرت اور بہادری و جانبازی کے کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں لیکن سپہ گری و میدان جنگ کے زیادہ اہل ثابت ہوتے ہیں۔

(۳) اعلیٰ کرنوں اور ضعیف لہروں سے عزم و ہمت میں پختگی والے کاموں سے بے رغبتی

ہوتی اور اونچے درجہ کے کاموں پر نظر نہیں ہوتی ہے بلکہ اگر موقع ملے تو اعلیٰ کرنوں کے اثر سے رضاء الٰہی کی خاطر ترک دنیا پر آمادگی ہو جاتی ہے۔

(۴) ادنیٰ کرنوں اور ضعیف لہروں سے سستی و کاہلی اور درماندگی اور عاجزی وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ تمام چیزوں سے دست برداری میں عافیت نظر آتی اور موقع ملنے پر ترک دنیا کو ترجیح ہو جاتی ہے۔ اگرچہ رضاء الٰہی کے کام بھی زیادہ نہیں ہو پاتے ہیں۔

نرمی و لچک والی شکل کی چار بڑی قسمیں یہ ہیں:

(۱) اعلیٰ کرنوں اور قوی لہروں سے حکمتوں مصلحتوں اور اسرار و رموز دریافت کرنے کی اہلیت ہوتی اور ریسرچ و تحقیق کے کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بھی اگرچہ بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جس قدر ہوتے ہیں وہ موقع ملنے پر اپنے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں البتہ نرمی و لچک کی وجہ سے قیادت و سرداری کی اہلیت میں کمی آجاتی اور معتقدین کا حلقہ بھی زیادہ نہیں ہوتا ہے۔

(۲) ادنیٰ کرنوں اور قوی لہروں سے تحقیقی و تنقیدی امور کے بجائے تقلیدی امور کی طرف رغبت زیادہ ہوتی اور گہرائی کے بجائے ظواہر پر قناعت ہوتی ہے۔ نرمی و لچک کی وجہ سے قوی لہروں کی کارکردگی متاثر ہوتی اور کوئی نمایاں کام نہیں انجام دے پاتی ہیں۔

(۳) اعلیٰ کرنیں اور ضعیف لہریں

(۴) ادنیٰ کرنیں اور ضعیف لہریں

یہ دونوں قسمیں حد درجہ کمزور ہوتی ہیں۔ چوتھی قسم میں کرنوں کے ادنیٰ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتی ہیں اور تیسری شکل میں کرنوں کے اعلیٰ ہونے کے باوجود نرمی و لچک کی وجہ سے ان کی اصلی کارکردگی باقی نہیں رہتی ہے۔ بس ان کی وجہ سے دعا و مناجات وغیرہ میں سرور و انبساط کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب "حدیث کا درایتی معیار" میں مذکورہ قسموں کو اس طرح بیان کیا ہے۔

نزاع و کشمکش (سختی و مضبوطی) کی چار بڑی شکلیں یہ ہیں:

(۱) اعلیٰ انسانی بنیاد اور قوی حیوانی بنیاد

(۲) اعلیٰ انسانی بنیاد اور ضعیف حیوانی بنیاد (بقیہ: صفحہ ۵۵ پر)

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام (۱۲)

مزارعت اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ

از قلم : مولانا محمد طاسین

اسی طرح ائمہ مجتہدین کے درمیان بھی اس معاملے کے جواز و عدم جواز کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔ فقہاءِ احناف اس کے عدم جواز کے قائل ہیں جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :-

وقال اصحابنا من دفع الی حائک غزلا لینسجه بالنصف فهذا فاسد و للحائک اجر مثله (ص ۲۲۷ ۔ ج ۵ عمدۃ القاری)

ہمارے فقہاء احناف نے کہا ہے کہ جو شخص جولاہے کو سوت دیتا ہے کہ وہ نصف کے عوض اس کے لئے کپڑا بنے تو یہ معاملہ فاسد ہے۔ ایسی صورت میں جولاہے کیلئے اجر مثل ہوگا یعنی عام رواج کے مطابق اجرت۔

ترجمۃ الباب کے آخر میں امام بخاری نے ایک اور معاملے کے متعلق حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔ مقصد اس میں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ معاملہ جائز ہے تو بربنائے قیاس مزارعت کو بھی جائز ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان دونوں کے مابین کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ عمرؓ کے قول میں جس معاملے کا ذکر ہے اس کی صورت علامہ عینی وغیرہ کے بیان کے مطابق یہ کہ ایک شخص کے پاس مثلاً غلّہ ہے اور وہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اپنا باربرداری کا جانور نہیں۔ وہ دوسرے سے کہتا ہے آپ اپنا باربرداری کا جانور ایک دن کے لئے مجھے دے دو۔ میں اس پر لاد کر غلّہ دوسری جگہ منتقل کروں گا اور اس کے عوض آپ کو غلّے کا تہائی یا چوتھائی حصّہ دوں گا' اس معاملے کے متعلق عمرؓ نے کہا کہ اس میں کچھ حرج نہیں' غور سے دیکھا جائے تو یہ معاملہ مزارعت کے معاملہ سے مختلف ہے کیونکہ اس معاملے میں جانور والے فریق کو جو غلّہ ملتا ہے اس کے عوض جانور والے

کی طرف سے محنت بھی موجود ہوتی ہے جو وہ جانور کی دیکھ بھال وغیرہ میں کرتا ہے۔ اسی طرح مالی خرچہ بھی ہوتا ہے جو وہ جانور کی خوراک یعنی گھاس چارے اور دانے وغیرہ پر اٹھاتا ہے یعنی کام کرتے رہنے کی وجہ سے جانور کی قوتِ کارکردگی میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کی وہ اپنی محنت اور اپنے مال سے تلافی و تدارک کرتا ہے جبکہ مزارعت میں مالکِ زمین کی طرف سے ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔ نہ جسمانی محنت اور نہ مالی صرف، لہٰذا ایک کے جواز پر دوسرے کے جواز کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں جہاں تک ائمہ احناف کا تعلق ہے ان کے نزدیک یہ معاملہ فاسد ہے۔ علامہ عینی شرح بخاری میں اس جگہ لکھتے ہیں:

وعندنا لا یجوز ذٰلک وعلیه	اور ہم حنفیوں کے نزدیک یہ معاملہ جائز
اجرۃ المثل لصاحب الدابه	نہیں، اور اس صورت میں جانور کے
(ص ۲۳۷، ج ۵، عمدۃ القاری)	مالک کے لئے عام رواج کے مطابق

اجرت ہوگی منتقل شدہ غلّے کا کوئی حصّہ نہیں۔

حضرت امام بخاریؒ نے باب "المزارعۃ بالشطر ونحوہ" کے ترجمۃ الباب میں جوازِ مزارعت سے متعلق جو آثار و اقوال ذکر فرمائے ہیں چونکہ مزارعت کو جائز کہنے والے حضرات عموماً ان سے استدلال کرتے اور ان کا حوالہ دیتے ہیں لہٰذا ان تمام آثار و اقوال پر فرداً فرداً بحث کرنی پڑی تاکہ ان کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آئے اور یہ پتہ چل سکے کہ ان آثار سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

میں سمجھتا ہوں جس کے سامنے بھی مذکورہ تفصیل ہو وہ یہی کہے گا کہ ان آثار میں سے بعض روایت و درایت کے لحاظ سے ضعیف اور ساقط الاعتبار ہیں۔ اور بعض کا ہمارے زیرِ بحث مزارعت سے تعلق نہیں بلکہ دوسری نوعیت کی مزارعت سے ہے اور بعض کا سرے سے مزارعت سے کوئی تعلق ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے معاشی معاملات سے ہے جو بنیادی طور پر مزارعت سے مختلف اور الگ ہیں، ایسا لگتا ہے کہ امام بخاریؒ کا ذہنی رجحان مزارعت کے جواز کی طرف ہے اور چونکہ جواز کے متعلق ان کے سامنے سوائے حدیثِ خیبر کے اور کوئی حدیث نہیں۔ چنانچہ اس باب میں انہوں نے صرف وہی حدیث بیان کی ہے، اور حدیثِ خیبر کے متعلق چونکہ یہ قوی احتمال موجود ہے کہ وہ عام مزارعت سے متعلق نہ ہو اور ان مخصوص حالات سے تعلق رکھتی ہو جو فتح خیبر کے وقت مسلمانوں اور خیبر کے یہودیوں

کے تھے اور چونکہ امام بخاری سے کچھ عرصہ پہلے امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی معاملۂ خیبر کو مزارعت ماننے سے انکار کرچکے تھے لہٰذا امام بخاری نے اپنے موقف کی تائید و تقویت کے لئے ایسے آثار و اقوال ذکر فرمائے جو خود ان کے تجویز کردہ معیارِ صحت و قبولیت سے مطابقت نہ رکھتے اور سند و اسناد کے لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے، اور پھر جیسا کہ میں نے اس بحث کے شروع میں شارحینِ بخاری سے نقل کیا کہ امام صاحب ترجمۃ الباب میں صحیح و غیر صحیح اور قوی و ضعیف ہر قسم کی روایات بیان فرما دیتے ہیں۔

یہاں پر علامہ قابسیؒ کا وہ قول ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا جو علامہ ابن حجر نے شارح بخاری ابن التین کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس کا جواب دینے کی ناکام کوشش فرمائی ہے، اس سے کچھ پہلے علامہ ابن حجر نے قابسیؒ کے اس اعتراض کو جو انہوں نے قیس بن مسلم کے اثر پر کیا تھا نقل کرکے اپنی طرف سے اس کا جو جواب دیا وہ بھی اطمینان بخش نہ رہا، ابن التین مالکی نے علامہ قابسیؒ کا جو قول نقل کیا ہے وہ یہ کہ:

انما ذکر البخاری ھذہ الآثار فی ھذا الباب لیعلم انہ لم یصح فی المزارعۃ علی الجزء حدیث مسند۔	بخاری نے اس باب میں یہ آثار اس لئے ذکر کئے ہیں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مزارعت علی الجزء کے ثبوت میں کوئی صحیح مسند حدیث موجود نہیں۔

(ص ۸، ج ۵، فتح الباری)

حافظ ابن الحجر نے قابسیؒ کی اس بات کو طنزیہ عجیب و غریب کہہ کر ان الفاظ سے اس کا جواب لکھا ہے:

کانہ غفل عن آخر حدیث الباب وھو حدیث ابن عمر فی ذلک وھو معتمد من قال بالجواز۔ (ص ۸۔ ج ۵۔ فتح الباری)	گویا قابسیؒ یہ بات کہتے وقت اس حدیث کو بھول گیا جو امام بخاری نے آخر میں اس باب میں نقل فرمائی یعنی ابن عمر کی حدیث جو معاملہ خیبر سے متعلق اور جو ان لوگوں کی قابلِ اعتماد حدیث ہے جو مزارعت کے جواز کے قائل ہیں۔

حافظ صاحب کے اس جواب کے غیر تسلی بخش ہونے کی وجہ یہ کہ علامہ قابسیؒ ان علماء میں سے

ہیں جو معاملۂ خیبر کو عام مزارعت کا معاملہ مانتے ہی نہیں بلکہ خراج مقاسمت کا معاملہ مانتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک حدیثِ خیبر جوازِ مزارعت کے لئے حجّت نہیں، اگر حدیثِ خیبر قطعی طور پر عام مزارعت سے متعلق ہوتی تو متعدد صحابہؓ، تابعین، ائمہ مجتہدین مزارعت کو کبھی ناجائز نہ کہتے اور خود اس کے راوی حضرت ابن عمرؓ، رافعؓ بن خدیج سے حدیث سن کر مزارعت کو ترک نہ کرتے اور پھر اس کے عدم جواز کا فتوی نہ دیتے۔ صحیح البخاری کے اس مقام کی شرح میں علاّمہ محمد انور شاہ کشمیری فیض الباری میں لکھتے ہیں:

والمصنف یطلق فیہ ولا یمیز بین المزارعۃ وخراج المقاسمۃ ویتمسک بمعاملۃ اهل الخیبر وکل ذلك لعدم بلوغہ فی الفقہ مبلغہ فی الحدیث۔

اور مصنف یعنی امام بخاری علی الاطلاق ایک بات کہتے چلے جا رہے ہیں اور مزارعت اور خراج مقاسمت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے اور معاملہ اہل خیبر سے تمسک و استدلال کرتے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ فقہ میں اس بلند مقام پر نہیں پہنچے جس پر وہ حدیث میں پہنچے۔

اس کے بعد ان کی دوسری عبارت اس طرح ہے:

والمصنف لا یفرق بینهما ویجعل معاملۃ السلطان مع رعیتہ مزارعۃ مع ان السلطان ایضا لیس بمالك للارض ههنا۔

ص ۲۹۶ ج ۳ ۔ فیض الباری

اور مصنف یعنی امام بخاری دو معاملوں کے درمیان فرق نہیں کرتے اور سلطان کے معاملے کو رعیت کے ساتھ مزارعت قرار دیتے ہیں پھر جبکہ سلطان زمین کا اس معاملے میں مالک بھی نہیں۔ گویا مزارعت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک شخص زمین کا مالک ہو۔

پھر آگے چل کر مزید یہ لکھتے ہیں

فان حقیقۃ المعاملۃ مع اهل خیبر لم تتنقح عندہ فقد یجعلها اجارۃ واخری مزارعۃ ولا تصحان الا ان تکونا ملکا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم

اہل خیبر کے ساتھ جو معاملہ ہوا تھا امام بخاری پر اس کی پوری حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہوئی۔ لہٰذا وہ کبھی اس کو اجارہ قرار دیتے ہیں اور کبھی مزارعت، اور یہ دونوں اس وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب زمین،

والمسلمين انما اذا كانت ملكا لانفسهم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ملکیت ہو
فلا نصح هذه ولا تلك فلا تكون	لیکن جب وہ ان لوگوں کی ملکیت نہ ہو تو
الا خراجا مقاسمة	نہ یہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ وہ پس وہ نہیں ہو سکتا
(ص ۳۰۱ - ج ۳ - فیض الباری)	مگر خراج مقاسمت کا معاملہ

اب میں کچھ دوسرے آثارِ صحابہ و تابعین نقل کرتا ہوں جو شرح معانی الآثار میں علامہ طحاوی نے بیان کئے اور جن کو جواز مزارعت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔

عن الحجاج بن ارطاة عن ابی	حجاج بن ارطاۃ نے ابو جعفر محمد بن علی سے
جعفر محمد بن علی انه كان	روایت کیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نصف
ابو بكر يعطي الارض على الشطر	پیداوار پر زمین کاشتکار کے لئے دیتے
(ص ۲۶۲ - ج ۲)	تھے۔

یہ روائت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے کیونکہ اس کی سند کے ایک راوی حجاج بن ارطاۃ کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں میں علماء جرح و تعدیل کے جو اقوال ہیں ان کے مطابق وہ ناقابل اعتماد ہے مثلاً تہذیب التہذیب میں ہے:

قال الساجی کان مدلسا	الساجی نے کہا حجاج بن ارطاۃ مدلس
صدوقا سیئ الحفظ لیس بحجة فی	صدوق، اور خراب حافظے کا راوی
الفروع والاحکام، وقال مسعود	تھا۔ فروع اور احکام میں وہ حجت نہیں۔
السنجری عن الحاکم لا یحتج به	مسعود سنجری نے حاکم کے حوالے سے
وکذا قال الدارقطنی وقال	کہا وہ اس قابل نہیں کہ اس کی بات کو
ابن حبان ترکه ابن المبارک	حجت مانا جائے۔ یہی بات دارقطنی نے
وابن مهدی ویحیی القطان	بھی فرمائی۔ اور ابن حبان نے کہا کہ اس کو
ویحیی بن معین واحمد بن	ابن المبارک، ابن مہدی یحیی القطان
حنبل۔	یحیی بن معین اور احمد بن حنبل نے
ص ۱۹۸ - ج ۲ - تہذیب التہذیب)	متروک کہا اور نظر انداز کیا۔

اور چونکہ مزارعت کا مسئلہ بھی فروع و احکام میں سے ہے لہٰذا اس کے متعلق حجاج بن ارطاۃ کی روائت ناقابلِ حجت ہے۔ اور اس کا کوئی اعتبار نہیں، چوٹی کے ائمہ حدیث کا

اسے ترک اور نظر انداز کرنا، اس کے غیر معتمد علیہ اور غیر ثقہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔
علاوہ ازیں اس اثر میں دوسرا عیب و نقص یہ ہے کہ اس میں اس واسطے یا واسطوں کا بیان نہیں جن کے ذریعے حضرت ابوجعفر الباقر کو یہ علم ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مزارعت پر اپنی زمین دیتے تھے، کیونکہ انہوں نے خود تو یہ دیکھا نہیں اور دیکھتے بھی کیسے جبکہ ان کی پیدائش حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کے تقریباً پینتالیس سال بعد ہوئی، پھر جب کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے اور کوئی بھی یہ روایت نہیں کرتا کہ حضرت ابوبکر مزارعت پر زمین دیا کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ نیچے کے کسی راوی نے خاص مصلحت کے تحت یہ بات اپنے پاس سے گھڑ کر ابوجعفر الباقر کے حوالے سے حضرت صدیق اکبرؓ کی طرف منسوب کر دی۔ اس روایت پر بھی تقریباً وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو قیس بن مسلم کی روایت کے متعلق پیچھے عرض کئے گئے۔

اخبرنا حماد بن سلمة ان	ہمیں حماد بن سلمہ نے بتایا کہ انہیں حجاج
الحجاج اخبره عن عثمان بن	بن ارطاۃ نے عثمان بن عبداللہ کے حوالے
عبد الله بن موهب انه قال	سے بتلایا کہ حضرت حذیفہ بن یمان اپنی زمین
كان حذيفة بن اليمان يكرى	تہائی اور چوتھائی کے بدلے مزارعت پر
الارض على الثلث والربع	دیتے تھے۔

(ص ۲۶۲ ۔ ج ۲)

اس روایت کے بھی ساقط الاعتبار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے راویوں میں حجاج بن ارطاۃ موجود ہیں جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا اور جس کی روایتوں کو محدثین نے خصوصاً احکام میں ناقابلِ احتجاج ٹھہرایا اور نظر انداز کیا ہے۔

تیسرا اثر جو امام طحاوی نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ:

حدثنا ابوبكرة قال حدثنا	ہم سے ابوبکرہ نے بیان کرتے ہوئے کہا
ابراهيم بن بشار قال حدثنا	کہ ہم سے ابراہیم بن بشار نے بیان کرتے
سفيان عن عمرو بن دينار عن	ہوئے کہا کہ ہم سے سفیان نے اور سفیان
طاؤس ان معاذا قدم اليمن	نے عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہوئے
وهم يخابرون فاتر هم	کہا کہ انہیں طاؤس نے بتلایا کہ حضرت

علی ذلک	معاذ بن جبل جب یمن آئے تو وہاں کے
(ص ۲۶۲ - ج ۲ - طحاوی)	لوگ مخابرہ کرتے تھے اور انہوں نے
	ان کو اس سے نہیں روکا۔

جو حضرات مزارعت کے جواز کے قائل ہیں انہوں نے اس اثر سے یہ مطلب لیا ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل جو حلال وحرام کے ممتاز عالم تھے ان کا دیکھتے ہوئے مخابرت سے لوگوں کو نہ روکنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک مخابرت جائز تھی ورنہ وہ ضرور منع فرماتے۔ اس کا جواب ان لوگوں کی طرف سے جو مزارعت کو ناجائز کہتے ہیں یہ کہ پہلے تو یہ اثر سند کے لحاظ سے ضعیف ہے اس لئے کہ اس میں سند میں ابراہیم بن بشار نامی جو راوی ہے اس کے متعلق تہذیب التہذیب میں لکھا ہے:

قال ابن معین ابراهیم بن بشار	یحییٰ بن معین نے کہا ابراہیم بن بشار
لیس بشیئ لم یکن یکتب	کچھ شے نہیں وہ سفیان کی بیان کردہ
عند سفیان وکان یملی	احادیث کو لکھا نہیں کرتا تھا اور پھر لوگوں
علی الناس مالم یقلہ سفیان	کے سامنے سفیان کے حوالے سے وہ کچھ
وقال النسائی لیس بالقوی:	بیان کرتا تھا جو سفیان نے نہیں کہا تھا ۔
(ص ۱۱۰ - ج ۱)	نسائی نے کہا وہ قوی نہیں ۔

اور چونکہ یہ روایت بھی اس نے سفیان کے حوالے سے بیان کی ہے۔ لہٰذا یحییٰ بن معین کے مذکورہ قول کے مطابق ساقط الاعتبار ہے، علاوہ ازیں صحیح احادیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قاضی اور مبلغ کی حیثیت سے یمن بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ سب سے پہلے وہاں کے لوگوں کو توحید ورسالت کی دعوت دینا، جب وہ اسے مان لیں تو پھر ان کو اسلامی عبادات، نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج کی تعلیم دینا، اس ہدایت میں حلال وحرام کی تبلیغ وتعلیم کا ذکر نہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مخابرت وغیرہ کے متعلق اس لئے کچھ نہ فرمایا ہو کہ اس بارے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت نہ تھی نہ اس لئے کہ مخابرت ومزارعت جائز اور حلال تھی۔

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک مخابرت کی تحریم کا واضح اعلان نہ ہوا ہو کیونکہ اس کی تحریم کا واضح اور قطعی اعلان اس وقت ہوا جب تحریم ربٰو کے متعلق سورہ بقرہ

کی آیت بالکل آخر میں یعنی ۹ سنہ ہجری میں نازل ہوئیں اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عام اعلان فرمایا۔

اس قسم کا ایک اور اثر شرح معانی الآثار میں اس طرح ہے۔

حدثنا محمد بن عمرو بن یونس قال حدثنی اسباط بن محمد الکوفی عن کلیب بن وائل قال قلت لابن عمر اتانی رجل له ارض وماء و لیس له بذر ولا بقر اخذت ارضه بالنصف فزرعتها ببذری وبقری فناصفته فقال حسن (ص ۲۶۲ - ج ۲)

ہم سے بیان کیا عمرو بن یونس نے یہ کہ مجھ سے بیان کیا اسباط بن محمد کوفی نے یہ کہ اس سے کلیب بن وائل نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ابن عمر سے عرض کیا کہ میرے پاس ایک آدمی آیا جس کے پاس زمین اور پانی تھے لیکن بیج اور بیل نہ تھے۔ میں نے اس کی زمین نصف پر لی اور اسے اپنے بیج اور بیلوں سے بویا اور پھر پیداوار آدھی اس کو دے دی اور آدھی خود لے لی۔ ابن عمر نے کہا اچھا کیا۔

یہ اثر بھی سند کے لحاظ سے ضعیف اور ساقط الاعتبار ہے کیونکہ اس کے دو راوی ایسے ہیں جن پر علماء جرح و تعدیل نے بے اعتمادی کا اظہار کیا ہے اور وہ محمد بن عمرو بن یونس اور اسباط بن محمد الکوفی ہیں، اول الذکر کے متعلق لسان المیزان میں ہے قال مسلمۃ بن قاسم کان عندنا ضعیفا (ص ۳۳۰ - ج ۵) مسلمہ بن قاسم نے کہا محمد بن عمرو بن یونس ہمارے نزدیک ضعیف تھا۔ اور ثانی الذکر کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے " والکوفیون یضعفونہ " اور محدثین کوفہ اس کی تضعیف کرتے اور اسے ضعیف بتلاتے تھے۔ اور اگر اس روایت کو سند کے اعتبار سے قوی بھی مان لیا جائے تو بہر حال تو اس کی حیثیت ان صحیح احادیث کے مقابلے میں کچھ نہیں جن میں صاف طور پر حضرت ابن عمر کا یہ بیان ہے کہ وہ پہلے مخابرہ کرتے تھے لیکن جب ان کو نہی کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اس معاملے کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا اور پھر اس اثر میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ ایک شخص کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہے جس کے پاس زمین اور پانی کا انتظام تو ہے لیکن بیج اور بیل نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود اپنی زمین کو کاشت کرنے سے عاجز اور معذور ہے۔ دوسرا شخص اس کے حال پر رحم کھاتے ہوئے اس سے زمین لیتا اور

اپنے بیج اور بیل سے کاشت کرتا ہے اور چونکہ آب پاشی وغیرہ کا انتظام زمین والے کی طرف سے ہے لہٰذا یہ دوسرا شخص پیداوار نصف خود لیتا اور نصف اس کو دے دیتا ہے اور دوسرے شخص کی ہمدردی کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمر نے اس کے معاملے کو حسن اور اچھا فرمایا ہو۔

اسی طرح مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عمر سے متعلق یہ جو اثر ہے:

قال عبدالرزاق اخبرنا الثوری	حضرت عبدالرزاق نے فرمایا کہ ہم سے ثوری
عن منصور عن مجاهد قال	نے بیان کیا انہوں نے منصور سے اور
کان ابن عمر یعطی ارضه بالثلث	منصور نے مجاہد سے روایت کیا کہ عبداللہ
(ص ۱۰۱ ، ج ۸)	بن عمر اپنی زمین تہائی پہ دیتے تھے۔

اس لئے قابل تاویل ہے کہ صحاح کی متعدد صحیح روایات یہ بتلاتی ہیں کہ عبداللہ بن عمر پہلے معاملہ کرتے تھے لیکن بعد میں جب ان کو پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے تو انہوں نے اس معاملے کو بالکل ترک کر دیا۔ لہٰذا قرین عقل یہی ہے کہ اس اثر میں کسی راوی نے اس حدیث کا پہلا حصہ تو بیان کر دیا اور دوسرا چھوڑ دیا جس میں اس کے ترک کر دینے کا ذکر تھا اور پھر اس تاویل کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مجاہد جو اس اثر کے راوی ہیں مزارعت کے عدم جواز کے قائل تھے جیسا کہ ہم آگے چل کر وہ روایات نقل کریں گے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی روائت کا راوی اپنی روائت کے خلاف رائے اور عمل رکھتا ہو تو وہ روائت ناقابلِ اعتماد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ روائت ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے ——!!!

اب میں کچھ وہ آثار صحابہؓ و تابعین ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مزارعت کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں :-

عن ابن عباس اذا اراد احدکم	حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے
ان یعطی اخاه ارضا فلیمنحها ایاه	کہ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کاشت
ولا یعطه بالثلث والربع	کے لئے زمین دینا چاہے تو مفت بلا معاوضہ
ضرائی بحواله کنز العمال	دے۔ تہائی اور چوتھائی پہ نہ دے۔
حدثنا ابوبکر قال حدثنا علی	ابوبکر بن ابی شیبہ نے کہا ہم سے بیان کیا

بن مسهر عن الشیبانی عن حبیب بن ابی ثابت قال کنت جالسا مع ابن عباس فی المسجد الحرام اذ اتاہ رجل فقال انا آخذ الارض من الدھاقین فاعتملھا ببذری و بقری فآخذ حقی و اعطیہم حقہم فقال لہ خذ راس مالک و لا تردد علیہ عینا فاعادھا ثلاث مرات کل ذلک یقول لہ ھذا۔ (ص ۳۴۶ ۔ ج ۶ ۔ ابن ابی شیبہ)

علی بن مسہر نے، اس نے روایت کیا شیبانی سے، اس نے حبیب بن ابی ثابت سے یہ کہ میں ابن عباس کے ساتھ مسجد الحرام میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں زمینداروں سے زمین لیتا ہوں اور اپنے بیج اور بیل سے اس میں کام کرتا ہوں پھر اپنا حق لے لیتا اور اور ان کا حق دے دیتا ہوں، اس کے جواب میں ابن عباس نے فرمایا اپنا رأس المال لے لو اور نہ لوٹاؤ اس پر عین کو، اس شخص نے تین مرتبہ یہ سوال دہرایا اور ہر مرتبہ انہوں نے اس کو یہی جواب دیا، گویا معاملہ ختم کرنے کا حکم دیا۔

حدثنا شعبۃ عن حماد انہ قال سألت سعید بن المسیب و سعید بن جبیر و سالم بن عبداللہ و مجاھدا عن کراء الارض بالثلث والربع فکرھوہ۔

(ص ۲۶۲ ۔ ج ۲ ۔ طحاوی)

ہم سے بیان کیا شعبہ نے کہ حماد نے ان سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے پوچھا سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، سالم بن عبداللہ اور مجاہد سے تہائی اور چوتھائی پر کراء الارض یعنی مزارعت کے متعلق تو انہوں نے اس کے متعلق کراہیت کا اظہار کیا اور حرام و ممنوع بتلایا۔

عن منصور قال کان ابراھیم یکرہ کراء الارض بالثلث والربع

(ص ۲۶۲ ۔ ج ۲ ۔ طحاوی)

منصور نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ ابراہیم تہائی اور چوتھائی کے بدلے کراء الارض کو ناجائز سمجھتے تھے۔

عن حماد بن سلمۃ عن قتادۃ عن الحسن انہ کان یکرہ کراء الارض

حماد بن سلمۃ نے قتادہ سے روایت کیا، اس نے حسن بصری سے یہ کہ وہ بھی تہائی

بالثلث والربع
(ص ۲۶۲ - ج ۲ - طحاوی)

اور چوتھائی کے بدلے کراء الارض یعنی مزارعت کو ناجائز گردانتے تھے۔

عن منصور بن المعتمر عن سعید بن جُبَیر مثله
(ص ۲۶۲ - ج ۲ - شرح معانی الآثار)

منصور بن معتمر نے سعید بن جبیر سے بھی ایسا ہی روایت کیا یعنی وہ بھی تہائی اور چوتھائی پر کراء الارض کو ناجائز گردانتے تھے ــــ!

اخبرنا حماد عن قیس بن سعد اخبرهم عن عطاء مثله
(ص ۲۶۲ - ج ۲ - کتاب مذکور)

ہمیں بتلایا حماد نے روایت کرتے ہوئے قیس بن سعد سے کہ قیس نے عطاء سے ایسی ہی بات روایت کی یعنی وہ بھی مزارعت کو ناجائز کہتے تھے۔

عن حمید الطویل و یونس بن عبید عن الحسن انه کان یکرہ ان یکری الرجل الارض من اخیه بالثلث والربع
(ص ۲۶۲ - ج ۲ - کتاب مذکور)

حمید الطویل اور یونس بن عبید نے روایت کیا کہ حسن بصری اس چیز کو مکروہ اور ناجائز کہتے تھے کہ آدمی اپنی زمین اپنے بھائی کو تہائی اور چوتھائی کے عوض کاشت کے لئے دے۔

عن خالد الحذاء عن عکرمة انه کره المزارعة بالثلث و الربع۔
(ص ۲۴۶ - ج ۶ - ابن ابی شیبة)

خالد الحذاء نے عکرمہ سے روایت کیا کہ وہ تہائی اور چوتھائی پر مزارعت کو ناجائز گردانتے تھے۔

عن منصور عن مجاهد قال لا یصلح من الزرع الا الارض تملك رقبتها او ارض یمنحکها رجل۔
(ص ۲۴۹ - ج ۶ - ابن ابی شیبة)

منصور نے مجاہد سے روایت کیا یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ کسی زمین میں کاشت درست نہیں سوائے اس زمین کے جس کے تم خود مالک ہو اور اس زمین کے جو تجھے کسی شخص نے منحہ کے طور پر مفت کاشت کے لئے دی ہو۔

عن طارق قال سمعت سعید بن المسیب یقول لا یصلح الزرع غیر ثلاث : ارض یملک رقبتها او منحة او ارض بیضاء یستاجرها بذهب او فضة
(ص ۱۴۴ - ج ۲ - سنن النسائی)

طارق سے روایت ہے کہا کہ میں نے سعید بن المسیب سے یہ فرماتے سنا کہ کاشت درست نہیں سوائے تین قسم کی زمینوں کے : ایک وہ زمین جس کا وہ مالک ہو دوسری وہ زمین جو منحہ ہو اور تیسری وہ زمین جس کو اس نے سونے چاندی کے عوض اجارے پہ لیا ہو

علامہ ابن حزم نے المحلّی میں دو اثر اور ذکر کئے ہیں جو اس طرح ہیں۔

حدثنا الاوزاعی قال کان عطاء و مکحول و مجاهد والحسن البصری یقولون : لا تصلح الارض البیضاء بالدراهم ولا بالدنانیر ولا معاملة الا ان یزرع الرجل ارضه او یمنحها۔
(ص ۲۱۳ - ج ۸ - المحلّی)

ہم سے بیان کیا اوزاعی نے یہ کہ عطاء، مکحول، مجاہد، حسن بصری کہتے تھے کہ سفید زمین یعنی باغ سے خالی زمین کی کاشت درست نہیں نہ دراہم کے بدلے اور نہ دیناروں کے بدلے اور نہ پیداوار کے ایک حصّہ کے بدلے، سوائے اس زمین کے جسے اس کا مالک خود کاشت کرے یا وہ منحہ کے طور پہ ہو۔

حدثنا ابواسحاق السبیعی عن الشعبی عن مسروق انه کان یکره المزارع، قال الشعبی فذلک الذی منعنی ولقد کنت من اکثر اهل السواد ضیعة۔
(ص ۲۱۳ - ج ۸)

ہم سے بیان کیا ابواسحاق سبیعی نے اس نے روایت کیا شعبی سے مسروق کے متعلق یہ کہ وہ مزارعت کو برا سمجھتے تھے، شعبی نے کہا یہی وہ چیز ہے جس نے مجھے مزارعت سے روک رکھا ہے حالانکہ میں اہل سواد میں سب سے زیادہ زمین رکھتا ہوں۔

مذکورہ آثار سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تابعین اور تبع تابعین کی اچھی خاصی تعداد مزارعت و مخابرت کے حق میں نہ تھی اور اسے ایک مکروہ، حرام اور ناجائز معاملہ گردانتی تھی اور اس میں جو چوٹی کے تابعین شامل تھے وہ ابراہیم النخعی، حسن بصری،

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

۱	اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام		۱/۵۰
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۳	راہ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں	مفصل مختصر	۳/- ۲/-
۴	دعوت الی اللہ		۱/۵۰
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	ادنیٰ اعلیٰ	۲/- ۳/-
۷	قرآن اور امن عالم		۱/۵۰
۸	علامہ اقبال اور ہم		۲/-
۹	عظمت صوم		۲/
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ		۱۰/-
۱۱	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		۱۲/-
۱۲	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی		۳/-
۱۳	سرافگندیم		۴/
۱۴	مطالبات دین		۸/-
۱۵	تحریک جماعت اسلامی	ادنیٰ اعلیٰ	۱۰ ۲۰
۱۶	شہید مظلوم	ادنیٰ اعلیٰ	۳ ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان		۵/-
۱۸	تنظیم اسلامی کی دعوت		۴/-
۱۹	سانحہ کربلا		۳/-
۲۰	رسول کامل صلے اللہ علیہ وسلم		۶/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسولؐ		۶/-
۲۲	معراج النبیؐ		۳/-
۲۳	اسلام میں عورت کا مقام		۱۰/-

عربی ترجمہ :

۱	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن ؟	۵

فارسی ترجمہ :

۲	دین قرآن بگردن مسلمان	زیر طبع

انگریزی تراجم :

۳	The Obligations Muslims owe to the Quran.	5/-
	The way to Salvation in the light of Surah Al-'Asr.	5/-
۵	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead	4/-
۶	The Quran & World Peace.	4/-
۷	Rise & Decline of Muslim Ummah.	5/-

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی مطبوعات میں ایک مزید اہم اضافہ

معراج النبی

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

جس میں موصوف نے اس محیر العقل واقعہ کو قرآن مجید اور

احادیث شریف نیز عقلی استدلال سے واضح و مبرہن کیا ہے

عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۴۰

قیمت ـــــ فی نسخہ تین روپے ـــــ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی ۱